الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

# تفسیر ابنِ کثیر اردو

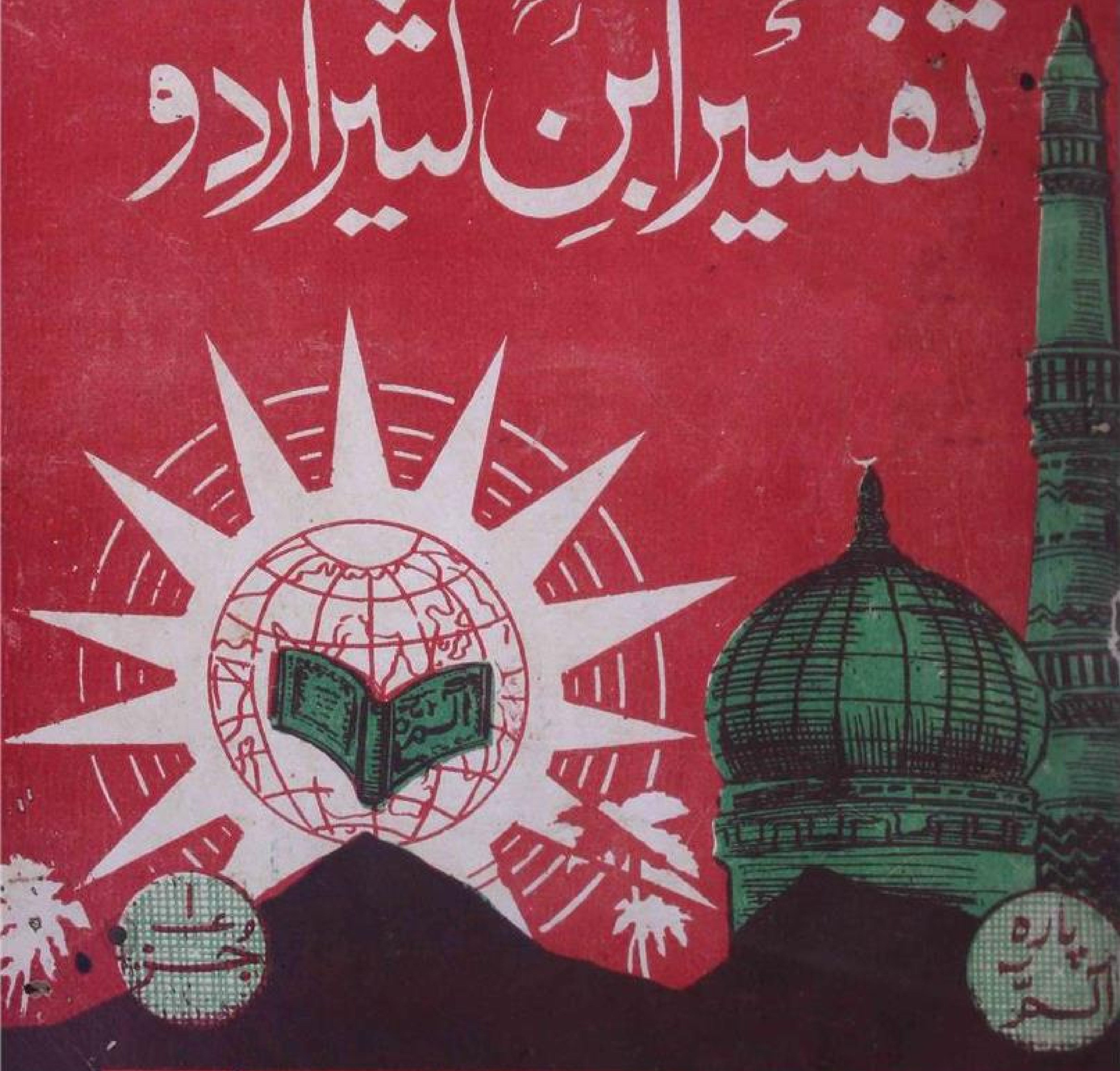
الٓمٓ
جزء ۱
پارہ الٓمٓ

باہتمام: محمد عبدالغفور ابن امیر محمد عبدالقادر الحسینی حیدرآباد اے پی

علامہ ابن کثیرؒ کی بلند پایہ تفسیر قرآن کا مکمل ترجمہ

# تفسیر ابن کثیرؒ اردو

جس کو ہر زمانہ کے علماء کرام کی قبولیت کا شرف حاصل ہے

تمام مفسرین اس پر متفق ہیں کہ سب سے زیادہ قرآن کریم کو بطریق
سلف صالحین سمجھانے والی تفسیر تفسیرِ ابن کثیر ہی ہے اور
اُس کے بعد تمام عربی و اردو تفاسیر اسی سے ماخوذ ہیں

## پارہ --- اوّل (الف - ل - م) جزء ۱

---

باہتمام: محمد عبد الغفور ابن میر محمد عبد القادر الحسینی حیدرآباد (اے، پی)

---

مطبوعہ رفیق مشین پریس کوچہ نسیم مچھلی کمان حیدرآباد دکن
(ہدیہ دو روپیہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# حیات امام حافظ عماد الدین ابن کثیر[عہ]

(مولانا محمد عبد الرشید نعمانی)

**نام ونسب** اسمٰعیل نام، ابو الفدا کنیت، عماد الدین لقب، اور ابن کثیر عرف ہے، سلسلہ نسب یہ ہے:-

اسمٰعیل بن عمر بن کثیر بن ضو بن ذرع[۱] القیسی[۲] البصروی ثم الدمشقی

آپ ایک معزز اور علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ آپ کے والد شیخ ابو حفص شہاب الدین عمر اپنی بستی کے خطیب تھے اور آپ کے بڑے بھائی شیخ عبد الوہاب ایک ممتاز عالم اور فقیہ تھے۔

---

عہ ہم نے اس تذکرہ کے مرتب کرنے میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی ہے: (۱) اختصار علوم الحدیث، از حافظ ابن کثیر مطبوعہ مطبع ماجدیہ مکہ کرمہ ۱۳۵۳ھ اس پر شیخ محمد بن عبد الرزاق حمزہ کے حواشی اور تعلیقات ہیں اور شروع میں ان ہی کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے جس میں "حیاۃ الامام ابن کثیر" کے عنوان سے پانچ صفحات میں امام موصوف کا تذکرہ لکھا ہے۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ از حافظ شمس الدین ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن (۳) ذیل تذکرۃ الحفاظ از حافظ ابو المحاسن حسینی دمشقی المتوفی ۷۶۵ھ مطبوعہ دمشق، (۴) الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ از عبد القادر قرشی حنفی المتوفی ۷۷۵ھ مطبوعہ دائرۃ المعارف ۱۳۳۲ھ (۵) الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ از حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ (۶) لحظ الالحاظ بذیل طبقات الحفاظ از حافظ تقی الدین بن فہد المتوفی ۸۷۱ھ (۷) ذیل طبقات الحفاظ از حافظ سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ مطبوعہ دمشق (۸) کشف الظنون عن اسامی الکتاب والفنون از علامہ حاجی خلیفہ المتوفی ۱۰۶۷ھ مطبوعہ استنبول ۱۳۶۰ھ (۹) شذرات الذہب فی اخبار من ذہب از علامہ ابن العماد حنبلی المتوفی ۱۰۸۹ھ مطبوعہ مصر ۱۳۵۱ھ (۱۰) البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع از قاضی محمد بن علی شوکانی المتوفی ۱۲۵۰ھ مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ (۱۱) ابجد العلوم از نواب صدیق حسن خاں قنوجی المتوفی ۱۳۰۷ھ مطبوعہ مطبع صدیقی بھوپال ۱۲۹۵ھ (۱۲) تعلیقات بر ذیول تذکرۃ الحفاظ از علامہ محدث زاہد کوثری المتوفی ۱۳۷۱ھ

---

[۱] حافظ ابو المحاسن کے ذیل میں یہ لفظ ذال کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور شذرات الذہب میں زا کے ساتھ۔

[۲] حافظ ابن حجر کی درر کامنہ اور حافظ سیوطی کے ذیل میں القیسی ہی مذکور ہے۔ لیکن حافظ ابن فہد کے ذیل میں بسلسلہ وفیات جہاں حافظ ابن کثیر کے دونوں صاحبزادوں زین الدین عبد الرحمن اور بدر الدین محمد کی وفات کا ذکر آیا ہے، دونوں جگہ القرشی لکھا ہے اور نواب صدیق حسن خان کی ابجد العلوم میں اور محمد بن عبد الرزاق حمزہ کے مقدمہ میں بھی یہ مرقوم ہے۔

## ولادت و تعلیم و تربیت

آپ کی ولادت ۷۰۰ھ[۱] یا ۷۰۱ھ میں بمقام مجدل ہوئی جو ملک شام کے مشہور شہر بصریٰ کے اطراف میں ایک قریہ ہے، اس وقت آپ کے والد یہاں کے خطیب تھے، ابھی آپ تیسرے یا چوتھے برس میں ہی تھے کہ والد بزرگوار نے ۷۰۳ھ میں وفات پائی اور نہایت ہی کمسنی میں آپ کو یتیمی کا داغ اٹھانا پڑا، باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو بڑے بھائی نے اپنے آغوش تربیت میں لے لیا۔ والد کی وفات کے تین سال بعد یعنی ۷۰۶ھ میں آپ اپنے برادر بزرگوار کے ساتھ دمشق چلے آئے اور یہیں آپ کی نشو ونما ہوئی ابتدا میں اپنے بڑے بھائی سے فقہ کی تعلیم پائی بعد کو شیخ برہان الدین ابراہیم بن عبد الرحمن فزاری معروف بابن فرکاح شارح تنبیہ المتوفی ۷۲۹ھ اور شیخ کمال الدین ابن قاضی شہبہ سے اس فن کی تکمیل کی، اس زمانہ میں دستور تھا کہ طالب علم جس کو حاصل کرتا اس فن کی کوئی مختصر کتاب زبانی یاد کرلیتا چنانچہ آپ نے بھی فقہ میں التنبیہ فی فروع الشافعیہ، مصنفہ شیخ ابو اسحاق شیرازی المتوفی ۴۷۶ھ کو حفظ کرکے ۷۱۸ھ میں سنا دیا اور اصول فقہ میں علامہ ابن حاجب مالکی المتوفی ۶۴۶ھ کی مختصر کو زبانی یاد کیا۔ اصول کی کتابیں آپ نے علامہ شمس الدین محمود بن عبد الرحمن اصفہانی شارح مختصر ابن حاجب المتوفی ۷۴۹ھ سے پڑھی تھیں۔

فنِ حدیث کی تکمیل آپ نے اس عہد کے مشہور اساتذۂ فن سے کی تھی۔ علامہ سیوطی ذیل تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں سمع الحجار والطبقة یعنی حجار[۲] اور اس طبقہ کے علماء سے آپ نے سمع حدیث کیا۔

حجار کے ہم طبقہ وہ علماء جن سے آپ نے علم حدیث حاصل کیا، اور جن کا ذکر خصوصیت سے آپ کے تذکرہ میں علماء نے کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں (۱) عیسیٰ بن المطعم (۲) بہاء الدین قاسم بن عساکر المتوفی ۷۲۳ھ (۲) عفیف الدین اسحاق بن یحییٰ الآمدی المتوفی ۷۲۵ھ (۴) محمد بن زراد (۵) بدر الدین محمد بن ابراہیم معروف بابن سویدی المتوفی ۷۱۱ھ (۶) ابن الرضی (۷) حافظ مزی (۸) حافظ ابن تیمیہ (۹) حافظ ذہبی (۱۰) عماد الدین محمد بن الشیرازی المتوفی ۷۴۹ھ۔

---

[۱] حافظ سیوطی نے ذیل تذکرۃ الحفاظ میں اور علامہ ابن العماد نے شذرات الذہب میں سنہ ولادت ۷۰۰ھ لکھا ہے اور حافظ ابو المحاسن حسینی نے ذیل تذکرۃ الحفاظ میں اور قاضی شوکانی نے البدر الطالع میں ۷۰۱ھ بتایا ہے اور حافظ ابن حجر نے الدرر الکامنہ میں ۷۰۰ھ یا اس کے کچھ بعد بیان کیا ہے اور حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ کے خاتمہ میں لکھتے ہیں یہ ۷۰۰ھ کے بعد یا اسی سنہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

[۲] حجار اس عہد کے بڑے نامور محدث گزرے ہیں یہ "مسند الدنیا" (دنیا کو اسناد بتانے والے) اور "رحلۃ الآفاق" (جس کی طرف آفاق سے سفر کیا جائے) کہلاتے تھے، ان کا درس ساری دنیا میں مشہور تھا دور دراز ممالک سے لوگ سفر کرکے آتے اور ان سے حدیث کی سند لیکر واپس ہوتے تھے، ان کی کنیت ابو العباس، لقب شہاب الدین اور نام احمد ہے، حجار اور ابن الشحنہ عرف ہیں، سلسلہ نسب یہ ہے احمد بن ابی طالب بن ابی النعم نعمۃ بن حسن بن علی بن بیان الدیر مقرنی ثم الصالحی، حنفی المذہب تھے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ میں اور حافظ شمس الدین ابن طولون نے الغرف العلیہ فی ذیل الجواہر المضیہ میں آپ کا بڑا مبسوط تذکرہ لکھا ہے۔ آپ کے شیوخ اور مرویات بہت زیادہ ہیں، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ آپ نے اس قدر طویل عمر پائی کہ دادا سے لیکر پوتوں تک کو درس دیا، چنانچہ دمشق وغیرہ میں ستر بار سے زیادہ صرف بخاری کا درس دیا اور اپنا وہ اعزاز واکرام دیکھا کہ جس سے زیادہ ہو نہیں سکتا، حفاظ حدیث آپ سے چن چن کر آپ سے حدیثیں سنتے اور دور دور سے سفر کرکے آتے اور اژدحام کئے ہوئے رہتے تھے۔ وفات سے ایک دن پہلے محب الدین ابن المحب نے آپ سے صحیح بخاری شروع کی دوسرے دن ظہر تک سلسلہ درس جاری رہا، عین ظہر کے قریب ۲۵ صفر ۷۳۰ھ کو آپ نے انتقال فرمایا رحمۃ اللہ۔

لیکن ان تمام حضرات میں سب سے زیادہ جس سے آپ کو استفادہ کا موقع ملا وہ محدث شام حافظ جمال الدین یوسف بن عبدالرحمٰن مزی شافعی مصنّف تہذیب الکمال المتوفی ۷۴۲ھ ہیں حافظ مزی نے خصوصی تعلق کی بنا پر اپنی صاحبزادی کا آپ سے نکاح کردیا تھا۔ اس رشتہ نے اس تعلق کو اور زیادہ استوار کردیا۔ سعادت مند شاگرد نے اپنے محترم استاد کی شفقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، مدت مدید تک حاضر خدمت رہے اور ان کی اکثر تصانیف کا جس میں تہذیب الکمال بھی داخل ہے خود ان سے سماع کیا اور اس فن کی پوری تکمیل ان ہی کی خدمت میں رہ کر کی چنانچہ سیوطی لکھتے ہیں وتخرج بالمزی ولازمہ وبرع اسی طرح حافظ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ سے بھی آپ نے بہت کچھ علم حاصل کیا تھا اور عرصہ تک ان کی صحبت میں رہے تھے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ مصر سے آپ کو دبوسی، وانی[1] اور ختنی[2] وغیرہ نے حدیث کی اجازت دی تھی۔

## منزلتِ علمی

امام ابن کثیر کو علم حدیث کے علاوہ فقہ، تفسیر، تاریخ اور عربیت میں بھی کمال حاصل تھا، چنانچہ علامہ ابن العماد حنبلی، ابن حبیب سے ناقل ہیں:-

| | |
|---|---|
| انتہت الیہ ریاسۃ العلم فی التاریخ والحدیث والتفسیر | ان پر تاریخ، حدیث اور تفسیر میں ریاست علمی ختم ہوگئی۔ |

اور مشہور مورخ علامہ ابو المحاسن جمال الدین یوسف ابن تغری بردی حنفی، المنہل الصافی، المستوفی بعد الوافی میں لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وکان لہ اطلاع عظیم فی الحدیث والتفسیر والفقہ والعربیۃ | حدیث، تفسیر، فقہ اور عربیت میں ان کو بڑی معلومات تھیں۔ |

اور حافظ ابو المحاسن حسینی فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وبرع فی الفقہ والتفسیر والنحو وامعن النظر فی الرجال والعلل | فقہ، تفسیر اور نحو میں ماہر تھے اور رجال وعلل حدیث میں بڑی گہری نظر پیدا کی تھی۔ |

خاص طور پر علم حدیث میں تو ان کا یہ پایہ ہے کہ حفاظ حدیث میں شمار کئے جاتے ہیں چنانچہ، حافظ ابو المحاسن حسینی اور علامہ سیوطی نے تذکرۃ الحفاظ پر جو ذیل لکھے ہیں اس میں اس کا تذکرہ لکھا ہے اور خود امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ کے خاتمہ میں جہاں اپنے ممتاز شیوخ حدیث اور رفقاء درس کا تعارف کرایا ہے، ان کا بھی ذکر ہے۔

---

[1] غالباً حافظ امین الدین محمد بن ابراہیم وانی حنفی المتوفی ۷۳۵ھ مراد ہیں، حافظ سیوطی نے ذیل تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے اور ان کو حافظ حدیث میں شمار کیا ہے، حافظ عبدالقادر قرشی بھی حدیث میں ان کے شاگرد ہیں چنانچہ انھوں نے طبقات الحنفیۃ میں ان کا ذکر کیا ہے اور ان کو الامام المحدث کے القاب سے یاد کیا ہے۔

[2] یہ مصر کے نامور محدث بدرالدین یوسف بن عمر ختنی حنفی ہیں "مسند البلاد المصریۃ" کہلاتے تھے، علو اسناد میں منفرد تھے، ۷۳۱ھ میں ۹۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ امام تقی الدین سبکی، احمد دمیاطی اور حافظ عبدالقادر قرشی کے فن حدیث میں استاد ہیں، حافظ قرشی نے الجواہر المضیۃ میں ان کا تذکرہ لکھا ہے۔

شعر و سخن کا بھی ذوق تھا لیکن آپ کی نظم متوسط درجہ کی ہوتی تھی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

تمر بنا الایام تتری وانما نساق الی الآجال والعین تنظر

(دن پیاپے گزرتے جاتے ہیں اور ہم آنکھوں دیکھے موت کی طرف ہنکائے چلے جا رہے ہیں ....)

فلا عائد ذاک الشباب الذی مضی ولا زائل هذا المشیب المکدر

(سو اب نہ تو وہ گزری ہوئی جوانی لوٹ کر آسکتی ہے اور نہ یہ کدورت بھرا بڑھاپا زائل ہونے والا ہے)

تیسرے مصرع میں اگر ذاک الشباب کی بجائے صفو الشباب ہوتا تو بڑا بلیغ ہوتا۔

## علماء کا آپ کی خدمت میں خراج تحسین

حافظ زین الدین عراقی المتوفی ۸۰۶ھ سے کسی نے پوچھا تھا کہ مغلطائی[1]، ابن کثیر، ابن رافع اور حسینی ان چاروں معاصرین میں کون سب سے بڑا ہے، حافظ عراقی نے جواب دیا ان میں سب سے زیادہ وسیع الاطلاع اور انساب کے عالم تو مغلطائی ہیں اور سب سے زیادہ متون و تواریخ کے حافظ ابن کثیر ہیں، اور سب سے زیادہ طلب حدیث میں لگنے والے اور مؤتلف و مختلف کے عالم ابن رافع ہیں اور سب سے شیوخ معاصرین سے باخبر اور تخریج کے واقف حسینی ہیں۔

اور حافظ ذہبی نے المعجم المختص میں ابن کثیر کا ذکر ان الفاظ سے شروع کیا ہے الامام المفتی المحدث البارع فقیہ متفنن ومحدث متقن مفسر اور تذکرۃ الحفاظ کے خاتمہ میں ان القاب کے ساتھ یاد کرتے ہیں الفقیہ المفتی المحدث ذی الفضائل اور اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

وله عناية بالرجال والمتون والفقه
وخرج وناظر وصنف وفسر وتقدم

ان کو رجال، متون حدیث اور فقہ کے ساتھ اعتناء ہے انہوں نے احادیث کی تخریج کی، مناظرہ، تصنیف کی، تفسیر لکھی اور آگے بڑھ گئے۔

اور حافظ حسینی کے ان کے بارے میں یہ الفاظ ہیں الشیخ الامام العالم الحافظ المفید البارع اور حافظ سیوطی فرماتے ہیں الامام المحدث ذو الفضائل اور علامہ ابن العماد لکھتے ہیں الحافظ الکبیر اور حافظ ابن حجی المتوفی ۸۱۶ھ جو آپ کے نامور شاگرد ہیں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں:۔

حفظ من ادرکناه لمتون الاحادیث
واعرفهم بجرحها ورجالها وصحيحها
وسقيمها وكان اقرانه وشيوخه
يعترفون له بذلك وما اعرف انى
اجتمعت به على كثرة ترددى
اليه الا واستفدت منه

ہم نے جن لوگوں کو پایا ان سب میں وہ متون احادیث کے سب سے بڑے حافظ اور جرح اور رجال اور صحیح اور ضعیف کے سب سے زیادہ پہچاننے والے تھے اور اس بارے میں ان کے معاصرین اور اساتذہ بھی ان کے معترف تھے اور مجھے یاد نہیں کہ باوجود میرے کثرت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے کبھی ایسا اتفاق ہوا کہ میں آپ سے ملا ہوں اور استفادہ نہ کرسکا ہوں۔

اور حافظ ابن ناصر الدمشقی الرد الوافر میں ان کا تذکرہ اس طرح شروع کرتے ہیں الشیخ الامام العلامۃ

---

[1] مشہور حفاظ حدیث میں ہیں حنفی تھے۔ حافظ ابن فہد اور حافظ سیوطی نے اپنے اپنے ذیل میں ان کا تذکرہ لکھا ہے۔ ۷۶۲ھ میں وفات پائی۔

الحافظ عماد الدین ثقة المحدثین عمدة المورخین، علم المفسرین

اور حافظ ابن حجر عسقلانی (جن کے متعلق صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ "ان کا قلم لوگوں کے اظہار معائب میں بُرا تھا اور زبان اچھی تھی کاش معاملہ اُلٹا ہوتا کہ خوبی باقی رہتی"[1] ان کو بھی امام ابن کثیر کے متعلق اتنا تسلیم ہے کہ واشتغل بالحدیث مطالعة فی متونه ورجاله حدیث کے متون اور رجال کے مطالعہ میں مشغول رہے تاہم اپنی عادت کے مطابق یہ ریمارک کر گئے ہیں۔

| | |
|---|---|
| ولم یکن علی طریق المحدثین فی تحصیل العوالی وتمییز العالی من النازل ونحو ذلک من فنونهم وانما هو من محدثی الفقها۔ | یہ عالی اسانید کی تحصیل اور عالی و نازل کی تمیز اور اسی قسم کے دیگر فنون میں جو محدثین کے خاص فن ہیں، محدثین کی طرح نہ تھے بلکہ یہ تو فقہاء کے محدث تھے۔ |

لیکن حافظ سیوطی نے اس کا بڑا اچھا جواب دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| قلت العمدة فی علم الحدیث معرفة صحیح الحدیث وسقیمه وعلله واختلاف طرقه ورجاله جرحاً وتعدیلاً واما العالی والنازل ونحو فهو من الفضلات لا من الاصول المهمة۔ | میں کہتا ہوں اصل چیز علم حدیث میں صحیح اور سقیم کی پہچان اور علل اور اختلاف طرق کا علم اور رجال کی جرح و تعدیل سے واقفیت ہے، رہا عالی[2] و نازل وغیرہ سو یہ زوائد میں داخل ہیں نہ کہ اصول مہمہ میں۔ |

اور علامہ محدث زاہد الکوثری لکھتے ہیں:-

اگرچہ حافظ ابن کثیر پر متون حدیث کے حفظ کرنے کا زیادہ غلبہ تھا۔ لیکن ان کی حیثیت اتنی گری ہوئی بالکل نہ تھی کہ وہ طبقات رواۃ اور ان کے احوال کی معرفت کے اعتبار سے عالی و نازل کی بھی تمیز نہ کر سکتے ہوں بلکہ یہ بات تو ایسے شخص پر بھی مخفی نہیں رہ سکتی جو علم رجال میں ان سے بدرجہا کمتر ہو اور بھلا یہ کس طرح ہو سکتا تھا جب کہ وہ ایک طویل مدت تک مزی کی خدمت میں برابر حاضر رہے اور التکمیل کے جمع کرنے پر لگے رہے اور حافظ ابن حجر کی اندرونی باتیں ان لوگوں کے تذکرہ میں کھل جاتی ہیں جو فضل و کمال میں مشہور ہیں۔"

مورخین نے حافظ ابن کثیر کے حافظہ اور فہم کی خاص طور پر تعریف کی ہے، ابن العماد لکھتے ہیں کان کثیر الاستحضار قلیل النسیان، جید الفهم

---

[1] اصل عبارت یہ ہے کان قلم ابن حجر سیئا فی مثالب الناس ولسانه حسنا ولیته عکس لیبقی الحسن (ضمن الجواہر والدرر)

[2] جس سند میں وسائط کم ہوں وہ عالی ہے اور جس میں زیادہ ہوں وہ نازل ہے۔ فقہاء کا اصل کام ہے مسائل کا استنباط اس لئے ان کی نظر زیادہ تر متن حدیث پر ہوتی ہے اور وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس سے مسئلہ کیا نکلا، سند سے انہیں صرف اتنی بحث ہوتی ہے کہ اس میں جتنے لوگوں کے نام لئے جا رہے ہیں بس وہ معتبر اور قابل قبول ہوں، باقی رہی یہ بات کہ اس واسطے زیادہ ہیں یا کم یہ چیز ان کی نظر میں چنداں اہم نہیں، لیکن ارباب روایت میں اس کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ ان کے نزدیک صرف ایک واسطہ کو کم کرنے کے لئے بھی سفر مستحسن ہے۔

## درس و افتا، ذکر الٰہی شگفتہ مزاجی

حافظ ابن کثیر کی تمام عمر درس و افتا اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی، حافظ ذہبی کی وفات کے بعد مدرسہ ام صالح اور مدرسہ تنکزیہ (جو اس زمانہ میں علم حدیث کے مشہور مدرسے تھے) میں آپ شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز رہے، بڑے ذاکر شاغل تھے، چنانچہ ابن حبیب نے آپ کے متعلق لکھا ہے امام ذی التسبیح والتهلیل، طبیعت بڑی شگفتہ پائی تھی، لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھے، حافظ ابن حجر نے آپ کے اوصاف میں حسن الفاکهة کے الفاظ استعمال کئے ہیں یعنی بڑا پر لطف مزاح کیا کرتے تھے، غالباً اسی قسم کا یہ واقعہ بھی ہے کہ جب حافظ زین الدین عراقی جو فن حدیث[1] میں امام حافظ علاء الدین ابن ترکمانی حنفی مصنف الجوہر النقی فی رد علی البیہقی کے تلمیذ خاص اور ان ہی کے ساختہ پرداختہ تھے، شیخ الاسلام تقی الدین سبکی کے درس میں حاضر ہوئے تو شیخ الاسلام نے اپنے درس میں بڑی عظمت کے ساتھ ان کا ذکر کیا اور بڑے اہتمام سے ان کا تعارف کرایا اور ان کی معرفت واتقان کی بہت تعریف کی، اس پر حافظ ابن کثیر بولے کہ مجھے تو ان سے یہ بھی بعید معلوم ہوتا ہے کہ یہ ماء مشمس (وہ پانی جو دھوپ سے گرم ہو گیا ہو) سے وضوء کے بارے میں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، اسی کو نکال سکیں۔

## علامہ ابن تیمیہ سے خصوصی تعلق

اخیر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حافظ ابن کثیر کو اپنے استاذ علامہ ابن تیمیہ سے خصوصی تعلق تھا جس نے آپ کی علمی زندگی پر گہرا اثر ڈالا تھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ بعض ان مسائل میں بھی ابن تیمیہ سے متاثر تھے جن میں وہ جمہور سلف سے متفرد ہیں، چنانچہ ابن قاضی شہبہ اپنے طبقات میں لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| کانت له خصوصية بابن تيمیه ومناضله | ان کو ابن تیمیہ کے ساتھ خصوصی تعلق تھا اور ان کی طرف |
| عنه واتباع له فی کثیر من آرائه وکان | سے لڑا کرتے تھے اور بہت سی آراء میں ان کی اتباع کرتے تھے |
| یفتی برائه فی مسئلة الطلاق وامتحن | چنانچہ طلاق کے مسئلہ میں[2] بھی ان ہی کی رائے پر فتوے دیتے |
| بسبب ذلك واوذی | تھے جس کے نتیجے میں آزمائش میں پڑے اور ستائے گئے۔ |

## وفات

اخیر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی، جمعرات کے دن شعبان کی چھبیس تاریخ ۷۷۴ھ میں وفات پائی (رحمۃ اللہ) اور مقبرہ صوفیہ میں اپنے محبوب استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے پہلو میں دفن کئے گئے، آپ کے کسی شاگرد نے آپ کی وفات پر بڑا درد انگیز مرثیہ لکھا ہے، جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

لفقدك طلاب العلوم تأسفوا ‏ ‏ وجادوا بدمع لا یبید عزیز
ولو مزجوا ماء المدامع بالدما ‏ ‏ لکان قلیلا فیك یا ابن کثیر

(شائقین علوم تمہارے اٹھ جانے پر متاسف ہیں اور اس کثرت سے آنسو بہا رہے ہیں کہ تھمنے ہی کو نہیں آتے اور اگر وہ آنسوؤں کے ساتھ خون بھی ملا دیتے تب بھی اے ابن کثیر تمہارے لئے یہ تھوڑا تھا)

---

[1] حافظ ابن فہد، ذیل تذکرۃ الحفاظ میں حافظ عراقی کے ترجمے میں لکھتے ہیں:۔ اخذ علم الحدیث عن الشیخ علاء الدین ابن الترکمانی وبه تخرج وانتفع

[2] شیخ ابن تیمیہ کی رائے میں اگر تین طلاقیں ایک ہی ساتھ دی جائیں تو وہ ایک شمار ہوگی۔

پس ماندگان میں دو صاحبزادے بڑے نامور ہوئے ہیں ایک زین الدین عبدالرحمٰن جن کی وفات ۷۹۲ھ میں ہوئی ہے اور دوسرے بدرالدین ابوالبقاء محمد یہ بڑے پایے کے محدث گزرے ہیں، انھوں نے ۸۰۳ھ میں بمقام رملہ وفات پائی ہے، ان دونوں کا ذکر حافظ ابن فہد نے اپنے ذیل میں بسلسلہ وفیات کیا ہے۔

## تصنیفات

آپ نے تفسیر، حدیث، سیرت اور تاریخ میں بڑی بلند پایہ تصانیف، یادگار چھوڑی ہیں، یہ آپ کے اخلاص کا ثمرہ اور حسن نیت کی برکت تھی کہ بارگاہ ایزدی سے ان کو قبول عام اور شہرت دوام کی مسند عطا ہوئی، مورخین نے آپ کی تصانیف کی افادیت اور ان کی قبولیت کا ذکر خاص طور سے کیا ہے، ذہبی لکھتے ہیں:- ولہ تصانیف مفیدۃ ابن حجر کہتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| سادت تصانیفه فی البلاد فی حیاته | ان کی زندگی ہی میں ان کی تصانیف شہر شہر جا پہنچیں |
| وانتفع الناس بها بعد وفاته | اور ان کی وفات کے بعد لوگ ان سے نفع اندوز ہوتے رہے |

اور شوکانی لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وقد انتفع الناس بتصانیفه لاسیما التفسیر | لوگوں نے ان کی تصانیف خصوصًا تفسیر سے نفع اٹھایا۔ |

آپ کی جن تصانیف پر ہمیں اطلاع مل سکی وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- **تفسیر القرآن الکریم**:- جس کے متعلق حافظ سیوطی تصریح کرتے ہیں کہ لم یولف علی غطه مثله (اس طرز پر دوسری تفسیر نہیں لکھی گئی) اور محدث کوثری فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| هو من انفد کتب التفسیر بالروایة | یہ تفسیر بالروایہ میں سب سے زیادہ مفید کتاب ہے |

اور قاضی شوکانی لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وقد جمع فیه فاوعی، ونقل المذاهب والاخبار والآثار وتکلم باحسن کلام وانفسه | اس میں جمع کیا اور خوب محفوظ کر دیا۔ مذاہب نقل کیے، حدیثیں لکھیں آثار درج کیے اور بہت ہی عمدہ اور نہایت نفیس کلام فرمایا۔ |

مصنف اس کتاب میں سب سے پہلے تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول پر ایک آیت کی تفسیر اسی مضمون کی دوسری آیات کی روشنی میں کرتے ہیں پھر محدثین کی مشہور کتابوں سے اس کے بارے میں جو احادیث مروی ہیں ان کو نقل کر کے ان کی اسانید و رجال پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور اس کے بعد آثار صحابہ و تابعین کو لاتے ہیں، حافظ ابن کثیر کا یہ سب بڑا علمی کارنامہ ہے کہ انھوں نے تفسیر اور تاریخ سے اسرائیلیات کو بہت کچھ چھانٹ کر علیحدہ کر دیا ہے، اور سچ یہ ہے کہ اس اہم کام کے لئے ان جیسے بالغ نظر محدث ہی کی ضرورت تھی، یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اگر ان کی علمی خدمات میں صرف یہی ایک خدمت ہوتی تب بھی وہ ان کے فخر کے لئے کافی تھی، الحمد للہ یہ کتاب متداول ہے اور بارہا طبع ہو چکی ہے۔

۲- **البدایہ والنہایہ**:- یہ فن تاریخ میں ان کی بیش بہا تصنیف ہے اور مصر سے طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے اس میں بدء کائنات سے لے کر احوال آخرت تک درج ہیں، پہلے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور امم ماضیہ کا ذکر ہے پھر سیرت نبویہ

کا بیان ہے اور اس کے بعد خلافت راشدہ سے لیکر اپنے عہد تک کی مفصل تاریخ لکھی ہے پھر اشراط الساعة اور احوال آخرت کا بیان ہے، اس تاریخ میں بھی امام موصوف نے غرائب مناکیر اور اسرائیلیات کو چھانٹ دیا ہے، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| اعتمد فی نقله علی النص من الکتاب | گذشتہ ہزار ہا سال کے وقائع میں کتاب و سنت کی تصریح |
| والسنة فی وقائع الالوف السالفة و | پر اعتماد کیا ہے اور صحیح، ضعیف اور اسرائیلی روایات وغیرہ |
| میز بین الصحیح والمستقیم والخبر الاسرائیلی وغیرہ | کو جدا کر دیا ہے۔ |

مورخ ابن تغری بردی اس تاریخ کے متعلق لکھتے ہیں ھو فی غایة الجودة (یہ نہایت ہی خوب ہے) امام علامہ حافظ بدرالدین محمود عینی حنفی شارح بخاری نے اپنی تاریخ میں زیادہ تر اسی کتاب پر اعتماد کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اس کا اختصار بھی کیا ہے۔ کشف الظنون میں ہے کہ محمود بن محمد بن دلشاد نے البدایہ والنہایہ کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ اس تاریخ میں واقعات اور وفیات دونوں درج ہیں۔ سیرت نبویہ کا حصہ خاص طور پر سب سے بہتر ہے، مگر بے شمار مشاہیر علماء کا تذکرہ درج کتاب ہونے سے رہ گیا ہے۔ اس میں مصنف کی وفات سے ۲ سال قبل تک کے حالات آ گئے ہیں۔

**۳- التکمیل فی معرفة الثقات والضعفاء والمجاهیل**۔ صاحب کشف الظنون نے اس کتاب کا نام التکملة فی اسماء الثقات والضعفاء لکھا ہے، لیکن خود مصنف نے البدایہ والنہایہ اور اختصار علوم الحدیث میں یہی نام لکھا ہے، یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے فن رجال میں ہے اور حسب تصریح حافظ حسینی پانچ جلدوں میں ہے۔ اس میں مصنف نے حافظ مزی کی تہذیب الکمال اور حافظ ذہبی کی میزان الاعتدال کو جمع کر دیا ہے، اور جابجا اپنی طرف سے اس میں مفید اضافے بھی کئے ہیں، خود مصنف کی رائے اس کتاب کے بارے میں یہ ہے۔

| | |
|---|---|
| وھو انفع شیٔ للفقه البارع وکذلك | یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ جو ماہر فقیہہ اور اسی طرح |
| للمحدث | ایک محدث کے لئے بہت زیادہ نفع بخش ہے۔ |

**۴- الهدی والسنن فی احادیث المسانید والسنن**:- یہی کتاب ہے جو "جامع المسانید" کے نام سے مشہور ہے، مصنف نے اس میں مسند امام احمد بن حنبل، مسند بزار، مسند ابی یعلے، مسند ابن ابی شیبہ اور صحاح ستہ کی روایات کو جمع کر کے ان کو ابواب پر مرتب کر دیا ہے، محدث کوثری لکھتے ہیں ھو من انفع کتبه (یہ ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ نفع بخش ہے) اس کتاب کا قلمی نسخہ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے۔

**۵- طبقات الشافعیه**: اس میں فقہاء شافعیہ کا تذکرہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ شیخ محمد بن عبدالرزاق حمزہ نے شیخ حسین باسلامہ کے پاس دیکھا ہے جو مکہ معظمہ میں مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

**۶- مناقب الشافعی**:- یہ رسالہ امام شافعی کے حالات میں ہے، مصنف نے اس کا ذکر البدایہ والنہایہ میں امام شافعی کے تذکرہ میں کیا ہے، اس کا قلمی نسخہ بھی طبقات الشافعیہ کے ساتھ مجلد ہے، صاحب کشف الظنون نے اس رسالہ کا نام الواضح النفیس فی مناقب الامام ابن ادریس لکھا ہے۔

**۷- تخریج احادیث ادلة التنبیه**۔ **۸- تخریج احادیث مختصر ابن الحاجب**:- التنبیہ اور مختصر یہ دونوں

کتابیں وہی ہیں جن کو مصنف نے عہد طالب علمی میں حفظ کیا تھا۔ ان دونوں کتابوں میں کتب حدیث سے تخریج بھی لکھی ہے۔

**۹۔ شرح صحیح بخاری**:۔ اس کی تصنیف بھی شروع کی تھی مگر ناتمام رہ گئی، کشف الظنون میں ہے کہ صرف ابتدائی ٹکڑے کی شرح ہے۔ مصنف نے اس کا ذکر اختصار علوم الحدیث میں کیا ہے۔

**۱۰۔ الاحکام الکبیر**:۔ یہ کتاب بہت بڑے بیمانہ پر احادیث احکام میں لکھنی شروع کی تھی مگر کتاب الحج تک لکھ سکے تمام نہ کر سکے، مصنف نے اختصار علوم الحدیث میں اس کتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔

**۱۱۔ اختصار علوم الحدیث**:۔ نواب صدیق حسن خان نے منہج الوصول فی اصلاح احادیث الرسول میں اس کا نام الباعث الحثیث علی معرفۃ علوم الحدیث لکھا ہے، یہ علامہ ابن صلاح المتوفی سنہ ۶۴۳ھ کی مشہور کتاب "علوم الحدیث" معروف بہ مقدمہ ابن اصلاح کا جو اصول حدیث میں ہے، اختصار ہے، مصنف نے اس میں جابجا مفید اضافے کئے ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں ولہ فیہ فوائد (اس کتاب میں حافظ ابن کثیر کے بہت سے افادات ہیں)

**۱۲۔ مسند الشیخین**:۔ اس میں شیخین یعنی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے جو حدیثیں مروی ہیں ان کو جمع کیا گیا ہے مصنف نے اختصار علوم الحدیث میں ایک تصنیف مسند عمر کا ذکر کیا ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا وہ مستقل علیحدہ کتاب ہے یا اسی کا حصہ ثانی ہے۔

**۱۳۔ السیرۃ النبویہ**:۔ یہ سیرت پر بڑی طویل کتاب ہے۔

**۱۴۔ الفصول فی اختصار سیرۃ الرسول**:۔ یہ سیرت پر ایک مختصر کتاب ہے، مصنف نے اس کا ذکر اپنی تفسیر میں سورۂ احزاب کے اندر غزوۂ خندق کے بیان میں کیا ہے، اس کتاب کا قلمی نسخہ مدینہ منورہ میں کتب خانہ شیخ الاسلام میں موجود ہے۔

**۱۵۔ کتاب المقدمات**:۔ اس کا ذکر مصنف نے اختصار علوم الحدیث میں کیا ہے۔

**۱۶۔ مختصر کتاب المدخل للبیہقی**:۔ اس کا ذکر بھی اختصار علوم الحدیث کے مقدمہ میں کیا ہے۔

**۱۷۔ الاجتہاد فی طلب الجہاد**:۔ جب فرنگیوں نے قلعہ ایاس کا محاصرہ کیا ہے اس وقت آپ نے یہ رسالہ امیر منجک کے لئے لکھا ہے، یہ رسالہ مصر سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

**۱۸۔ رسالۃ فی فضائل القرآن**:۔ یہ رسالہ بھی تفسیر ابن کثیر کے ساتھ مطبع المنار مصر میں طبع ہو چکا ہے۔

۱۹۔ مسند امام احمد بن حنبل کو بھی حروف پر مرتب کیا تھا اور اس کے ساتھ طبرانی کی معجم اور ابویعلی کی مسند سے زوائد بھی درج کئے تھے۔

امام ابن کثیر کی تمام تصنیفات میں یہ خوبی عیاں ہے کہ جو کچھ لکھتے ہیں نہایت تحقیق کے ساتھ لکھتے ہیں اور مفصل لکھتے ہیں، عبارت سہل اور پیرایہ بیان دلکش ہوتا ہے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تمام تعریفیں اُس خدا کیلئے ہیں جس نے اپنی کتاب کو الحمد کیساتھ شروع کیا اور فرمایا! اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ دوسری جگہ فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ الخ یعنی "ہر قسم کی تعریف کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے اپنے محبوب بندے پر قرآن کریم نازل کیا۔ جسمیں کوئی کجی نہیں۔ جو ہمیشہ دین کو قائم رکھنے والا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب سے اللہ کا پیغمبر لوگوں کو خبردار کردے اور جو لوگ ایمان لاکر نیک اعمال کرتے ہیں انھیں انکے بہترین اور نہ ختم ہونے والے اجر و ثواب کی خوشخبری سُنا دے اور جو لوگ اپنے جاہل باپ دادا کی سُنی سُنائی باتوں پر خدا کی اولاد مانتے ہیں اُنھیں بھی خبردار کردے کہ یہ بہت بڑی جسارت اور قطعاً غلط بات ہے جسکو وہ اپنے مُنہ سے نکال رہے ہیں۔ اے نبی تم انکے پیچھے خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو جس طرح اس پروردگار نے اپنی کتاب کو حمد سے شروع کیا اُسی طرح اس نے اپنی مخلوق کو بھی اپنی حمد سے شروع کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ یعنی سب تعریف اللہ ہی کیلئے ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اندھیرے اور اُجالے کو پیدا کیا۔ لیکن کفار باوجود اسکے بھی خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں" اسی طرح مخلوق کا خاتمہ بھی اپنی حمد و ثنا پر کیا۔ اہل جنت اور اہل جہنم کے انجام کا بیان کرکے ارشاد ہوتا ہے۔ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی تو دیکھے گا کہ فرشتے عرش (خداوندی) کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہونگے اور اپنے رب کی حمد و ثنا تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہونگے۔ فیصلے حق کیساتھ ہو چکے ہونگے اور کہدیا گیا ہوگا کہ تمام تعریفیں اللہ رب العلمین ہی کیلئے ہیں" اسی لئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ یعنی وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں سب تعریفیں اول اور آخر اسی کیلئے ہیں۔ اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤگے" ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ فَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ط یعنی "سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں آسمان اور زمین کی کُل چیزیں اسی کی ہیں۔ آخرت میں بھی حمد اسی کیلئے ہے وہی حکمت والا اور خبردار ہے اول آخر اسی کی تعریف ہے" یعنی جو کچھ اس نے پیدا کیا اور جو کچھ پیدا کریگا وہ ان سب میں تعریفوں والا ہے جیسا کہ نمازی سَمِعَ اللّٰهُ الخ کے بعد[1] کہتا ہے اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْءَ الْاَرْضِ وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ "اے اللہ اے ہمارے رب تیرے ہی لئے سب تعریفیں ہیں آسمان و زمین بھر جانیکے برابر اور انکے بعد بھی جس چیز کو تو بھر دینا چاہے" اسی لئے جنتی لوگ بھی حمد و ثنا کا الہام کئے جائینگے اور ان کے سانس کے ساتھ ہی بلاتکلف اللہ تعالیٰ کی تعریف اور اس کی تسبیح ادا ہوتی رہے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمتیں اور اس کی قدرت کاملہ اور اس کی زبردست سلطنت اور اس کی مسلسل رحمتیں اور اس کے ہمیشگی والے احسانات ان کے پیش نظر ہونگے اسی کو قرآن پاک نے بیان فرمایا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ یعنی

---

[1] عام طور پر مختصر کیا جاتا ہے کہ ربنا لك الحمد ۱۲ مصحح

ایمان کے ساتھ نیک عمل کرنے والوں کو ان کا رب ان کے ایمان کے ذریعہ ان نعمت والے باغوں کی راہ دکھائیگا جنکے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان کی آواز سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ اور آپس میں سلام کا تحفہ ہوگا اور ان کی گفتگو کا آخری ٹکڑا یہی ہوگا کہ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہان والوں کا رب ہے۔" اور فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رُسُلَهٗ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ "یعنی اللہ ہی کے لئے تعریف ہے جس نے اپنے رسولوں کو بشارتیں دینے والے اور خبردار کرنے والے بناکر بھیجا تاکہ رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کی کوئی حجت اللہ تعالیٰ پر باقی نہ رہے۔" ان رسولوں کا سلسلہ نبی اُمّی عربی مکی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا جو سب سے زیادہ واضح راہ کی ہدایت کرنے والے ہیں۔ آپؐ کے زمانے سے لیکر قیامت تک جتنے جنات و انسان ہیں ان سب کی طرف آپ نبی بناکر بھیجے گئے ہیں۔ جیساکہ قرآن پاک میں ہے۔ قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا الخ یعنی تم کہدو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں وہ خدا جو آسمان اور زمین کے ملک کا مالک ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ پس اے لوگو! تم سب ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ پر جو نبی ہے اُمّی ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ لوگو! انہی کی پیروی میں تمہاری ہدایت ہے" ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ "تاکہ میں تمہیں بھی ڈراؤں اور انھیں بھی جنھیں کلام اللہ پہنچے" پس جس عربی عجمی کالے گورے جن انسان کو یہ قرآن پہنچا آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم اس کے لئے ڈرانے والے ہیں۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ "یعنی اس کے ساتھ کفر کرنے والا جہنمی ہے" پس جو کوئی قرآن کے ساتھ کفر کرے وہ بحکم قرآن جہنمی ہے دوسری جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہوتا ہے۔ فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ "یعنی تم ان جھٹلانے والوں کو اور مجھ کو چھوڑ دو میں انھیں اس طرح بتدریج پکڑوں گا کہ انھیں معلوم بھی نہ ہوگا" رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ میری پیغمبری عام ہے۔ ہر سرخ و سیاہ کی طرف میں پیغمبر بناکر بھیجا گیا ہوں" مجاہدؒ فرماتے ہیں یعنی کل جن و انس کی طرف۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسان اور جناب کی طرف اللہ کے رسولؐ ہیں سب کو خداوند کریم کی وحی اور عزت والے قرآن کو آپ پہنچانے والے ہیں جس پاک کتاب کے باطل قریب بھی نہیں آسکتا جو حکمتوں اور تعریفوں والے خدا کا نازل کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس پاک کلام کو سمجھنے کی تاکید بھی اسی میں کردی ہے۔ فرمایا! "کہ تم کیوں قرآن پاک میں تدبر اور غور و فکر نہیں کرتے اگر یہ خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے ہوتا تو تم اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے" ایک جگہ فرمایا "اس مبارک کتاب کو ہم نے تیری طرف اُتارا تاکہ لوگ اس میں غور و خوض کریں اور عقلمند لوگ نصیحت حاصل کریں" دوسرے موقع پر فرمایا "یہ لوگ قرآن کے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل لگ گئے" پس علماء پر واجب ہے کہ کلام اللہ کا مطلب واضح کردیں اور اس کی صحیح تفسیر کردیں اور اُسے باقاعدہ طلب کریں اور سیکھیں اور سکھائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہم نے کتاب والوں سے عہد لیا ہے کہ وہ اسے بیان کرتے رہیں چھپائیں نہیں، لیکن ان لوگوں نے اُسے پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور اس کے بدلے دنیا طلب کرنے لگے، ان کا یہ بیوپار نہایت ہی بُرا ہے" ایک جگہ فرمایا "جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی رقم کے بدلے بیچتے پھریں ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، ان سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بات تک نہ کرے گا نہ ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا نہ انھیں پاک کرے گا بلکہ اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ پس دوسری اقوام و امم جن پر ہم سے پہلے آسمانی کتابیں نازل کی گئیں اور انھوں نے اس سے روگردانی کی اور دنیا کے حاصل کرنے اور اس کے جمع کرنے میں مشغول ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں کے پیچھے پڑ کر اللہ کی پاک کتاب کو چھوڑ دیا پروردگار نے ان کی مذمت بیان کی، مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ایسا نہ کریں جو مذمت کا سبب بنے، بلکہ انھیں چاہیئے کہ احکام خداوندی کی تعمیل میں بدل و جان لگے رہیں اور قرآن پاک کے سیکھنے سکھانے اور سمجھانے میں مشغول رہا کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کیا اب تک وہ وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اور جو ان کی

طرف حق آیا ہے اس سے ان کے دل کانپ اُٹھیں اور اُن کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں ان سے پہلے کتاب دی گئی، لیکن کچھ زمانہ گذرتے ہی ان کے دل سخت ہو گئے اور اکثر لوگ نافرمان ہو گئے۔ جان لو کہ مردہ زمین کو جلانا اللہ ہی کا کام ہے۔ ہم نے تو تمھاری سمجھ بوجھ کے لئے اپنی آیتیں بیان کر دیں۔" ان دونوں آیتوں کے ترجمے میں غور کرو کس لطافت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ جس طرح بارش سے خشک زمین لہلہانے لگتی ہے اسی طرح ایمان اور ہدایت سے وہ دل جو نافرمانیوں اور گناہوں کے باعث سخت ہو گئے ہوں نرم پڑ جایا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر جواد و سخی سے قبولیت کی امید پر ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ وہ مالک ہمارے دلوں کو بھی نرم کر دے آمین۔

سنو! تفسیر کا بہترین اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ اوّل تو قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے ہو اس لئے کہ ایک بیان کہیں مختصر ہے تو کہیں اس کی تفصیل بھی ہے اس کے بعد قرآن کی تفسیر حدیث سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ حدیث قرآن کریم کی شرح اور تفسیر ہے۔ بلکہ حضرت امام ابو عبداللہ بن محمد ادریس شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے تمام احکام قرآن ہی سے سمجھے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "ہم نے تم پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان خدا کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلے کر سکو۔ خبردار! تم خیانت کرنے والوں کے طرفدار مت بننا۔" ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ "ہم نے تو تم پر اسی لئے یہ کتاب اُتاری ہے کہ لوگوں کے اختلاف کا فیصلہ کر دیا کرو۔ یہ کتاب ایمانداروں کے لئے ہدایت و رحمت (کا باعث) ہے۔" ایک اور مقام پر فرماتا ہے! "ہم نے اس کے ذکر کو تیری طرف اس لئے اُتارا ہے کہ تم اسے لوگوں کو کھول کھول کر پہنچا دو تاکہ وہ غور کر سکیں۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "میں قرآن بھی دیا گیا ہوں اور اسی کے مثل ایک اور چیز بھی اسی کے ساتھ دیا گیا ہوں" اس سے مراد سنت ہے۔ یہ یاد رہے کہ احادیث بھی اللہ کی وحی ہیں جس طرح قرآن پاک بذریعہ وحی اُترا اسی طرح حدیث رسول بھی خداوندی ہے۔ مگر قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی غیر متلو حضرت امام شافعیؒ اور دوسرے بڑے بڑے ائمہ نے اسے دلائل سے خوب ثابت کر دیا ہے لیکن یہاں اسکے بیان کرنیکا موقع نہیں مقصد یہ ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر اولاً خود قرآن سے اور پھر حدیث سے کرنی چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذؓ کو یمن کی جانب بھیجا تو دریافت کیا کہ حکم کس طرح دو گے انھوں نے جواب دیا کتاب اللہ سے فرمایا اگر اس میں نہ پاؤ تو کہا سنت رسول اللہ سے۔ کہا اگر اس میں نہ پاؤ تو۔ کہا اب اجتہاد کروں گا۔ حضورؐ نے یہ جواب سنکر ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے نبی کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جو اس کے نبیؐ کو پسند ہے۔" یہ حدیث مسند میں بھی ہے اور سنن میں بھی اور سند بھی اس کی بہت عمدہ ہے۔ جیسا کہ اپنی جگہ اس کا ثبوت موجود ہے۔ اس بناء پر جب کسی آیت کی تفسیر قرآن و حدیث دونوں میں نہ ملے تو اقوال صحابہؓ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ وہ تفسیر قرآن کو بہت زیادہ جانتے تھے اس لئے کہ جو قرینے اور احوال اس وقت تھے ان کا علم انہی کو ہو سکتا ہے وہ اس وقت موجود اور حاضر تھے علاوہ ازیں کامل سمجھ بوجھ صحیح علم اور نیک عمل انھیں حاصل تھا۔ بالخصوص ان بزرگوں کو جو ان میں بھی بڑے مرتبہ کے اور زبردست عالم تھے جیسے چاروں امام جو خلفاء تھے اور رشد و ہدایت والے تھے یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت عثمان ذی النورینؓ۔ حضرت علی شیر خداؓ اور جیسے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت عبداللہؓ سے تو مروی ہے۔ فرماتے ہیں اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نہیں کہ میں جانتا ہوں کہ یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ میں اگر جانتا کہ کتاب اللہ کے علم میں کوئی مجھ سے زیادہ ہے اور وہاں تک میں کسی طرح پہنچ بھی سکتا ہوں تو ضرور اس کی شاگردی میں

اپنے آپ کو پیش کرتا۔" آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص جب تک دس آیتوں کا پورا مطلب نہ جان لیتا اور اس پر عمل نہ کر لیتا گیارھویں آیت نہیں پڑھتا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن سلمی تابعیؒ فرماتے ہیں ہم نے جن سے قرآن سیکھا وہ ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا جب تک ہم دس آیتوں کا علم و عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سیکھ لیتے آگے نہیں بڑھتے تھے، غرض قرآن کا علم اور قرآن پر عمل دونوں ہی کو سیکھا۔ انہی میں سے ایک قرآنی علوم کے زبردست ماہر حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور ترجمان القرآن ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے برکت کی دعا کی تھی اور کہا تھا اللّٰھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل "خدایا انھیں دین کی سمجھ عطا فرما اور قرآن کی تفسیر کا علم بھی نصیب کر۔" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے "قرآن کے بہترین ترجمان حضرت عبداللہ بن عباس ہیں۔" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس قول کو پیش نظر رکھ کر خیال کیجئے کہ ان کا انتقال ۳۲ھ میں ہوا اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان کے بعد بھی چھتیس سال تک زندہ رہے تو اس مدت میں آپ نے علم میں کس قدر ترقی کی ہوگی۔ حضرت ابو وائلؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن عباس امیر حج مقرر ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے خطبہ میں سورۂ بقرہ کی تلاوت فرمائی اور اس عمدگی سے تفسیر کی کہ اگر کفار ترک و دیلم بھی سن لیتے تو قطعاً مسلمان ہو جاتے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے اپنے اس خطبہ میں سورۂ نور کی تفسیر بیان فرمائی تھی یہی وجہ ہے کہ اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن سدی کبیر اپنی تفسیر میں انہی دو بزرگوں کی اکثر تفسیر نقل کیا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی اہل کتاب سے یہ بزرگ جو روایت لے لیا کرتے ہیں اسے بھی وہ بیان کر دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل سے روایت لینا مباح ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری طرف سے پہنچا دیا کرو اگرچہ ایک آیت ہی ہو۔ بنی اسرائیل سے بھی روایت لینے میں کوئی حرج نہیں مجھ پر قصداً جھوٹ بولنے والا قطعاً جہنمی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جنگ یرموک میں دو بوریاں یہود و نصاریٰ کی کتابوں کی پائی تھیں۔ ان کی باتیں بھی وہ اس حدیث کو مدنظر رکھ کر نقل کر دیا کرتے تھے، لیکن یہ یاد رہے کہ بنی اسرائیل کی یہ روایتیں صرف مسئلہ کی تائید اور اس کے استحکام کے لئے لائی جاتی ہیں۔ خود ان سے مسائل ثابت نہیں ہو سکتے۔ روایات بنی اسرائیل تین قسم پر ہیں۔ ایک تو وہ جن کی تصدیق خود ہمارے یہاں موجود ہے۔ یعنی قرآن پاک کی کسی آیت یا حدیث کے مطابق بنو اسرائیل کی کتاب میں بھی کوئی روایت مل جائے۔ اس کی صحت میں کوئی کلام نہیں دوسرے وہ کہ جن کی تکذیب خود ہمارے یہاں موجود ہو یعنی کسی آیت یا حدیث کے خلاف ہو۔ اس کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ تیسرے وہ کہ جس کی نہ ہم تصدیق کر سکتے ہیں نہ تکذیب اس لئے کہ ہمارے یہاں نہ تو کوئی ایسی روایت ہے جس سے مطابقت کی وجہ سے ہم اسے صحیح کہہ سکیں۔ کوئی ایسی روایت ہے جو اس کے مخالف ہو اور اس بنا پر ہم اسے جھوٹ اور غلط کہہ سکیں۔ لہٰذا یہ تیسری قسم کی روایتیں وہ ہیں جن سے ہم خاموش ہیں۔ نہ انھیں غلط کہیں نہ صحیح سمجھیں۔ البتہ انھیں ذکر کرنا جائز ہے، اور یہ روایتیں ہیں بھی ایسی جن میں ہمارے دین کا کوئی فائدہ نہیں۔ باوجود اس کے ایسی باتوں میں خود اہل کتاب میں بھی بڑے بڑے اختلافات موجود ہیں اور اسی وجہ سے ان روایتوں کو لینے والے مفسرین میں ایسے ہی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اصحاب کہف کے نام ان کے کتے کا رنگ۔ ان کی تعداد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لکڑی کس درخت کی تھی؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور پھر خدا کے حکم سے وہ جی اٹھے۔ وہ پرندے کیا کیا تھے؟ اور جس مقتول کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گائے ذبح کر کے اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا لگایا تھا اور اس سے خدا نے اسے زندہ کر دیا تھا، وہ ٹکڑا کونسا تھا؟ اور کس جگہ کا تھا؟ اور وہ کونسا درخت تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نور دیکھا تھا اور اس میں خدا کا کلام سنا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ بس یہ وہ چیزیں ہیں جن پر خدا نے پردہ ڈال رکھا ہے اور ہمیں ان کا جاننا نہ جاننا کوئی نفع نقصان نہیں پہونچا سکتا نہ اس کی تعیین میں کوئی دینی فائدہ ہے نہ دنیوی۔

ہاں یہ بات البتہ ہے کہ اس اختلاف کو نقل کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ خود قرآن پاک نے اصحاب کہف کی تعداد کا اختلاف نقل کیا ہے فرمایا ہے۔ سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ اصحاب کہف تین تھے اور ان کا کتا چوتھا تھا اور کہتے ہیں کہ پانچ تھے اور چھٹا کتا تھا۔ یہ سب ظنی باتیں ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا۔ اے نبیؐ تم کہہ دو کہ ان کی تعداد کو میرا رب ہی بخوبی جانتا ہے۔ تم ان سے اس بارے میں صرف سرسری گفتگو کرو۔ اور اس بارے میں ان سے نہ پوچھو۔ اس آیت نے بتادیا کہ ہمیں ایسے مقام میں کیا کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں تین قول بیان فرمائے دو کو تو ضعیف قرار دیا اور تیسرے پر ضعف کا حکم نہیں لگایا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح ہے۔ کیونکہ اگر یہ بھی باطل ہوتا تو ان دونوں کی طرح اسے بھی رد کر دیا جاتا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ان کی تعداد کا علم تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا پھر تم اس کی چھان بین میں کیوں لگو؟ کیوں نہ کہہ دو کہ ان کی تعداد کا حقیقی علم صرف خدائے تعالیٰ ہی کو ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جنھیں خدا تعالیٰ نے ان کی صحیح تعداد پر مطلع فرمایا ہے۔ جب یہ معلوم ہو چکا کہ وہ اٹکل پچو باتیں بنا رہے ہیں پھر اس کے پیچھے پڑنے اور ان سے دریافت کرنے کی کیا ضرورت۔ اسی طرح ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ کسی اختلاف کو نقل کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ تمام اختلافی اقوال بیان کر دیئے جائیں صحیح غیر صحیح پر تنبیہ کر دی جائے اور اس اختلاف کا فائدہ بھی بیان کر دیا جائے تاکہ بے کار کام میں پڑ کر کوئی شخص کار آمد شغل سے رک نہ جائے جو شخص اختلاف نقل کرنے میں تمام اقوال بیان نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے۔ ممکن ہے ٹھیک قول وہی ہو جسے اس نے چھوڑ دیا۔ اسی طرح جو شخص اختلاف نقل کر کے فیصلہ کئے بغیر چھوڑ دے اس نے بھی تقصیر کی۔ اگر غیر صحیح کو جان بوجھ کر صحیح کہہ دے پھر وہ جھوٹا ہے اور اگر جہالت سے ایسا کرے جب بھی خطاکار ہے اسی طرح جو شخص کسی ایسی باریک بات میں جس میں کوئی بڑا فائدہ نہ ہو بہت سارے اقوال اختلافی نقل کر دے یا ایسے اختلافات نقل کرنے بیٹھ جائے جن کے الفاظ مختلف ہوں مگر نتیجہ کے اعتبار سے یا تو اختلاف بالکل ہی اٹھ جاتا ہو یا معمولی اختلاف رہ جاتا ہو۔ اس نے بھی اپنے عزیز وقت کو بے کار ضائع کیا اور کوئی مفید کام نہیں کیا' اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص دو چھوٹے کپڑے پہن لے بھلائی اور سیدھی بات کی توفیق اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ ہے۔

**فصل** جب کسی آیت کی تفسیر قرآن حدیث اور اقوال صحابہ تینوں میں نہ ملے تو اکثر ائمہ دین نے کہا ہے کہ ایسے موقع پر تابعین کی تفسیر لی جائے جیسے مجاہد بن جبرؒ جو تفسیر میں خدا کی ایک نشانی تھے خود فرماتے ہیں کہ میں نے تین مرتبہ اول سے آخر تک حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے قرآن پاک سیکھا اور سمجھا۔ ایک ایک آیت کو پوچھ پوچھ سمجھ سمجھ کر پڑھا۔ ابن ملیکہؒ فرماتے ہیں خود میں نے حضرت مجاہدؒ کو دیکھا کہ کتاب قلم دوات لے کر حضرت ابن عباس کے پاس پہنچا کرتے اور تفسیر قرآن دریافت کر کے اس میں تحریر فرماتے۔ پورے قرآن کریم کی تفسیر اسی طرح نقل کی۔ حضرت سفیان ثوریؒ کا تو فرمان تھا کہ مجاہدؒ کسی آیت کی تفسیر کر دیں تو پھر اس کی تحقیق کرنا بے سود ہے۔ بس ان کی تفسیر کافی ہے حضرت مجاہدؒ کی طرح حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت عکرمہؒ جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مولی تھے اور حضرت عطاء بن ابی رباحؒ۔ حضرت حسن بصریؒ۔ حضرت مسروق بن اجدع۔ حضرت سعید بن مسیب حضرت ابو العالیہ۔ حضرت ربیع بن انس۔ حضرت قتادہ اور حضرت ضحاک بن مزاحم وغیرہ تابعین تبع تابعین اور ان کے بعد والوں کی تفسیر معتبر مانی جائے گی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں ان بزرگوں کے اقوال جب ذکر کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے الفاظ میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے تو بے علم لوگ اسے معنوی اختلاف سمجھ کر کہہ بیٹھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا' بلکہ کسی نے ایک چیز کی تعبیر اس کے لازمے کی۔ کسی نے اس کی نظیر سے ...... کسی نے خود اس چیز کو ہی بیان کر دیا پس ان صورتوں میں گو الفاظ میں اختلاف ہو، لیکن معنی ایک ہی رہتے ہیں۔ عقلمند کو چاہیے کہ ایسی جگہ لغزش نہ کھائے۔ وَاللّٰہُ الْھَادِیْ۔

شعبہ بن حجاج ؒ کہتے ہیں کہ جب تابعین کے اقوال فرعی مسائل میں حجت نہیں تو تفسیر قرآن میں کیسے حجت ہو جائیں گے؟ شعبہ ؒ کا یہ قول صحیح ہے کہ ان کا اختلاف کرنے والے پر ان کے اقوال حجت نہیں لیکن ان کے اجماعی اقوال کے حجت ہونے میں کوئی شک نہیں، ہاں اختلاف کے وقت نہ ان کا قول آپس میں ایک دوسرے پر حجت ہے۔ نہ غیروں پر اس وقت لغت قرآن اور حدیث اور عام لغت عرب اور اقوال صحابہ ؓ کی طرف رجوع کیا جائے گا ہاں صرف رائے سے تفسیر کرنا تو محض حرام ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے قرآن میں اپنی رائے کو دخل دیا یا جہالت سے کچھ کہہ دیا اس نے اپنی جگہ جہنم میں بنالی ابن جریر، ترمذی، ابوداؤد میں یہ حدیث ہے اور امام ترمذی علیہ الرحمۃ نے اسے حسن کہا ہے۔ یہی الفاظ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی منقول ہیں۔ حضرت جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے قرآن کریم میں اپنی رائے سے کچھ کہا اس نے خطا کی (ابن جریر) ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ امام ترمذی نے اسے غریب کہا ہے اور اس کے راوی سہیل پر بعض اہل قلم نے کلام بھی کیا ہے۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ جس نے اپنی رائے سے قرآن میں کوئی ٹھیک بات بھی کہدی جب بھی وہ خطاکار ہے۔ اس لئے کہ اس نے اس چیز کا تکلف کیا جس کا اُسے علم نہ تھا اور اس نے ایسی روش اختیار کی جس کا اختیار کرنا مناسب نہ تھا۔ پس اگرچہ اس کے مُنھ سے ٹھیک بات نکل گئی پھر بھی وہ خطاکار ہے۔ اس لئے کہ کام کو کام کے طریقہ پر اس نے نہیں کیا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی شخص بے علم ہو پھر فیصلے کرنے بیٹھ جائے اسے جہنمی کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے شخص کی صحیح بات پر مواخذہ کم ہو، لیکن ہے خطاکار۔ واللہ اعلم۔ دیکھئے تہمت لگا کر گواہ نہ پیش کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کاذب یعنی جھوٹا فرمایا ہے گو حقیقت میں وہ سچا ہی ہو اور جس کی نسبت وہ زنا کا الزام لگا رہا ہے، وہ واقعی زانی ہو لیکن چونکہ اسے اس خبر کو بلا شہادت پھیلانا ٹھیک نہ تھا اور اس نے پھیلائی تو جھوٹا ٹھہرا۔ واللہ اعلم۔

یہی وجہ تھی کہ سلف کی ایک بڑی جماعت بلا علم تفسیر کرنے سے بہت ڈرتی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے مجھے کون سی زمین اٹھائے گی اور کونسا آسمان سایہ دے گا۔ اگر میں قرآن میں وہ کہوں جو نہیں جانتا آپ سے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ کی تفسیر پوچھی جاتی ہے تو فرماتے ہیں مجھے کونسا آسمان سایہ دے گا اور کونسی زمین اٹھائے گی جب کہ میں قرآن میں وہ کہوں جو نہیں جانتا۔ یہ روایت منقطع ہے ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ممبر پر اسی آیت کی تلاوت کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں فَاكِهَةً کو تو ہم جانتے ہیں لیکن یہ اَبّ کیا چیز ہے؟ پھر خود ہی فرماتے ہیں کہ اے عمر اس تکلیف میں کیوں پڑو؟ حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھے۔ آپ کی قمیص کے پیچھے چار پیوند لگے ہوئے تھے آپ نے اس آیت وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ کی تلاوت کی اور کہا اَبّ کیا چیز ہے؟ پھر فرمانے لگے اس تکلیف کی تمہیں کیا ضرورت؟ اس کے نہ جاننے میں کیا حرج؟ مطلب یہ ہے اَبّ کا معنی تو معلوم ہے یعنی چارہ زمین کی پیداوار لیکن اس کی کیفیت کا کھلا ہوا علم نہیں۔ خود اسی آیت میں موجود ہے فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا۔ یعنی ہم نے زمین میں اناج اور انگور اگا دیئے۔ ابن جریر میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ ابن ابی ملیکہ ؒ فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کسی شخص نے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو آپ نے کچھ بیان نہ فرمایا، حالانکہ اگر اس کی تفسیر تم میں سے کسی سے پوچھی جاتی تو فوراً جواب دیدیتے۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ قرآن میں جو ایک ہزار سال کے برابر ایک دن کا ذکر ہے یہ کیا؟ آپ نے فرمایا اور پچاس ہزار سال کے برابر کے دن کا ذکر ہے وہ کیا؟ اس نے کہا میں تو آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ خیال فرمائیے کہ اتنے بڑے مفسر نے تفسیر میں کس قدر احتیاط برتی کہ جس بات کا علم نہ تھا اس کے بیان سے صاف انکار کر دیا۔ مفسر ابن جریر میں ہے کہ،

حضرت جندب بن عبداللہؓ سے ایک مرتبہ طلق بن حبیبؒ نے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو فرمانے لگے کہ اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں قسم ہے اگر تم یہاں سے چلے نہ جاؤ۔ یا فرمایا اگر یہاں بیٹھے رہو۔ حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن کی آیت کی تفسیر پوچھی جاتی تو فرماتے ہم قرآن میں کچھ نہیں کہتے۔ آپ کی یہ عادت مبارک تھی کہ جو کچھ معلوم ہوتا اسی کو قرآن کی تفسیر میں بیان فرماتے۔

ایک مرتبہ ایک شخص کے سوال پر آپ نے فرمایا مجھ سے قرآن کی تفسیر نہ پوچھو قرآن کی تفسیر اس سے پوچھو جو کہتا ہے کہ مجھ پر قرآن کی کوئی آیت مخفی نہیں۔ یعنی حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ یزید بن ابو یزید کہتے ہیں ہم حضرت سعید بن مسیب سے حلال وحرام کے مسائل پوچھتے تھے۔ آپ ان میں سب سے زیادہ عالم نظر آتے، لیکن جب ہم قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھتے تو ایسے خاموش ہو جاتے گویا سنا ہی نہیں۔ حضرت عبیداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں میں نے مدینہ کے بڑے بڑے فقیہوں کو دیکھا کہ قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے جھجکتے تھے جیسے سالم بن عبداللہ قاسم بن محمد سعید بن مسیب نافع رحمہم اللہ وغیرہم حضرت ہشامؒ فرماتے ہیں میں نے اپنے والد عروہؒ کو کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ عبیداللہ سلمانیؒ سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی جاتی ہے تو فرماتے ہیں جو لوگ قرآن کی آیتوں کو جانتے تھے کہ کس بارے میں نازل ہوئیں وہ تو اس دنیا کو خالی کر گئے اب تم ٹھیک ٹھاک اور سیدھے سادھے رہو۔ حضرت مسلم بن یسار فرماتے ہیں کہ جب تم کتاب اللہ کی تفسیر میں کچھ کہنا چاہو تو آگے پیچھے دیکھ لو، کیونکہ یہ خداوند تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے بات کہنی ہے۔ حضرت ابراہیمؒ فرماتے ہیں' ہمارے سب ساتھی قرآن کی تفسیر کو بڑی چیز جانتے تھے اور اس میں سخت احتیاط کرتے تھے۔ شعبیؒ فرماتے ہیں گو میں نے قرآن کریم کی ایک ایک آیت کا علم حاصل کر لیا ہے تاہم میں کہتے ہوئے جھجکتا ہوں اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے روایت کرنی ہے۔ حضرت مسروقؒ کا قول ہے کہ تفسیر میں بے حد احتیاط کرو تفسیر تو اللہ تعالیٰ سے روایت کرنی ہے۔

ان تمام اور ان جیسے اور آثار صحیحہ کا جو ائمہ سلف سے منقول ہیں یہ مطلب ہے کہ یہ علماء کرام ہرگز ہرگز بغیر علم کے قرآن کے معنی مطلب میں لب کشائی نہیں کرتے تھے۔ ہاں لغت کی رو سے یا شریعت کی رو سے جو تفسیر معلوم ہو اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی لئے خود ان بزرگوں کے پاکیزہ اقوال قرآن کریم کی تفسیر میں بکثرت مروی ہیں۔ کوئی یہ نہ کہے کہ جب یہ بزرگ قرآن کی تفسیر میں اس درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے اور تفسیر بیان نہیں فرماتے تھے۔ پھر ان سے تفسیر منقول کیوں ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ خاموش وہاں رہتے تھے جہاں نہیں جانتے تھے۔ اور کہتے اس جگہ تھے جہاں کا علم ہوتا تھا اور یہ دونوں ہی باتیں ہر ایک پر واجب ہیں یعنی بے علمی کے وقت چپ رہنا اور علم کو بیان کرنا قرآن فرماتا ہے۔ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ یعنی اے لوگوں کے سامنے بیان کرتے رہو اور چھپاؤ نہیں۔ حدیث شریف میں ہے جس سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے اور وہ باوجود جاننے کے اسے چھپائے قیامت کے دن اسے آگ کی لگام چڑھائی جائے گی۔ ابن جریر میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی انہی آیتوں کی تفسیر فرمایا کرتے تھے جن کی تفسیر جبرئیل علیہ السلام سمجھا جائیں۔ لیکن یہ حدیث منکر اور غریب ہے اور اس کے راوی جعفر جو محمد بن خالد بن زبیر بن عوام قریشی کے لڑکے ہیں۔ ان کی بابت حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ان کی حدیث میں متابعت نہیں کی جاتی۔ حافظ ابوالفتح ازدیؒ فرماتے ہیں یہ منکر الحدیث ہیں اگر یہ حدیث صحیح ہو تو بھی اس کا صحیح مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ آیتیں ہیں جن کے معنی اللہ تعالیٰ کے بتلائے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔ ایسی آیتوں کے مطالب حضورؐ کو بذریعہ جبرئیل علیہ السلام معلوم کرا دیئے جاتے تھے۔

امام ابو جعفر نے اس روایت کے جو معنی بیان فرمائے ہیں اس کا ماحصل بھی یہی ہے اور یہی معنی درست بھی ہو سکتے ہیں اس لئے کہ قرآن میں ایسی آیتیں بھی ہیں جن کا علم محض اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن کا علم علماء کو ہے اور ایسی آیتیں بھی ہیں جو عرب لوگ اپنے لغت سے سمجھ سکتے ہیں اور ایسی بھی ہیں کہ جن کے معنی مطلب اس طرح واضح ہیں کہ کسی کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں تفسیر کی چار قسمیں ہیں ایک تو کلام عرب سے معلوم ہو جاتی ہے۔ دوسری وہ جسکی جہالت میں کوئی معذور نہیں۔ تیسری وہ جسے ذی علم لوگ جان سکتے ہیں چوتھی وہ جسے خدا کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ ایک مرفوع

حدیث بھی اس بارے میں مروی ہے۔ لیکن اس کی اسناد میں کلام ہے اس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کا نزول چار طریق پر ہوا ہے۔ حلال حرام کی آیتیں جن سے اگر کوئی ناواقف رہا تو اس کا کوئی عذر قیامت کے دن کام نہ آئے گا اور وہ تفسیر جسے عرب بیان کریں اور وہ تفسیر جو ذی علم جان سکے اور وہ متشابہ آیتیں جن کا حقیقی علم بجز ذات باری تعالیٰ کے کسی اور کو حاصل نہیں جو لوگ اس کے جاننے کا دعوی کریں وہ جھوٹے ہیں، اس حدیث کی سند میں محمد بن سائب کلبی ہیں جو متروک الحدیث ہیں ہو سکتا ہے کہ انھوں نے موقوف روایت یعنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کو مرفوع حدیث سمجھ لی ہو۔ واللہ اعلم۔

## سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا مفید تر مقدمہ

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ سورۂ بقرہ۔ سورۂ آل عمران۔ سورۂ نساء۔ سورۂ مائدہ۔ سورۂ براۃ۔ سورۂ رعد۔ سورۂ نحل۔ سورہ حج سورۂ احزاب۔ سورۂ محمد۔ سورۂ فتح۔ سورۂ حجرات۔ سورۂ رحمٰن۔ سورہ حدید۔ سورۂ مجادلہ۔ سورۂ حشر۔ سورۂ ممتحنہ۔ سورۂ صف سورہ جمعہ۔ سورۂ منافقون۔ سورۂ تغابن۔ سورۂ طلاق۔ سورۂ تحریم۔ سورۂ زلزال اور سورۂ نصر۔ یہ سب سورتیں تو مدینہ شریف میں نازل ہوئیں اور باقی تمام سورتیں مکہ شریف میں نازل ہوئیں۔ قرآن کریم کی تمام آیتیں چھ ہزار ہیں۔ اس سے اوپر اختلاف ہے۔ بعض تو اس پر زیادہ نہیں بتلاتے۔ بعض دو سو چار ۲۰۴ آیتیں چھ ہزار سے زاید بتلاتے ہیں۔ بعض دو سو چودہ ۲۱۴ آیتیں بعض دو سو انیس ۲۱۹ بعض دو سو پچیس ۲۲۵۔ بعض دو سو چھبیس ۲۲۶۔ ابو عمرو دانی نے کتاب البیان میں یہ سب لکھا ہے۔ قرآن شریف کے کلمات کی نسبت حضرت عطا بن یسار فرماتے ہیں کہ ستتر ہزار چار سو انتالیس ۷۷۴۳۹ کلمات ہیں۔ حروف کی گنتی کی نسبت حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے کہ کل قرآن شریف کے حروف تین لاکھ اکیس ہزار ایک سو اسی ۳۲۱۱۸۰ ہیں۔ فضل بن عطا بن یسار فرماتے ہیں کہ کل حروف تین لاکھ تیئیس ہزار پندرہ ۳۲۳۰۱۵ ہیں۔ حجاج نے اپنے زمانہ میں قاریوں، حافظوں اور کاتبوں کو جمع کر کے دریافت کیا کہ قرآن کریم کے حروف کی گنتی کر کے مجھے بتاؤ تو سب نے حساب کر کے بالاتفاق کہا کہ تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس ۳۴۰۷۴۰ حروف ہیں پھر حجاج نے کہا اچھا حروف کے اعتبار سے آدھا قرآن شریف کہاں ہوتا ہے؟ تو حساب سے معلوم ہوا کہ سورہ کہف میں وَلْيَتَلَطَّفْ کی "ف" پر ٹھیک آدھا قرآن ہوتا ہے اور سورۂ براءت کی سو آیتوں پر قرآن کریم کا پہلا تہائی حصہ حروف کے اعتبار سے ختم ہوتا ہے۔ اور دوسری تہائی سورۂ شعراء کی سو آیت کے سرے پر یا ایک سو ایک آیت کے سرے پر ختم ہوتی ہے۔ اور تیسری تہائی آخر تک اور اگر منزلوں کا شمار کیا جائے یعنی سات حصے قرآن کریم کے لیے جائیں تو پہلی منزل صَدَّ کی "د" پر ختم ہوتی ہے جو اس آیت میں ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ اور دوسری منزل حَبِطَتْ کی "ت" پر ہوتی ہے جو سورہ اعراف کی آیت اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ میں ہے اور تیسری منزل اُكُلُهَا کے آخری "ا" پر جو سورۂ رعد میں ہے اور چوتھی منزل جعلنا کے "ا" پر جو سورۂ حج کی آیت جَعَلْنَا مَنْسَكًا میں ہے اور پانچویں منزل مُؤْمِنَةٍ کی "ۃ" پر جو سورۂ احزاب میں آیت وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ میں ہے۔ اور چھٹی منزل السَّوْءِ کی "ء" پر جو سورۂ فتح کی آیت الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ میں ہے اور ساتویں منزل قرآن پاک کے خاتمہ پر ہے۔ ابو محمد سلام حمانی کا بیان ہے کہ ہم نے چار مہینے کی متواتر محنت سے یہ سب باتیں معلوم کر کے حجاج کو بتائیں حجاج کا معمول تھا کہ ہر رات پاؤ قرآن شریف پڑھا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے پاؤ قرآن سورۂ انعام کے خاتمہ پر ہوتا ہے اور آدھا سورۂ کہف کے لفظ وَلْيَتَلَطَّفْ پر، اور پونا سورۂ زمر کے خاتمہ پر، اور پورا پورے قرآن پر۔ شیخ ابو عمرو دانی نے اپنی کتاب البیان میں ان باتوں میں بھی اختلاف نقل کیا ہے۔ رہے قرآن شریف کے پڑھنے کے اعتبار سے حصے اور اجزاء۔ سو مشہور تو تیس ۳۰ پارے ہیں۔ اور ایک حدیث میں صحابہ کرامؓ کا قرآن کریم کو سات منزلیں کر کے پڑھنے کا بیان ہے۔ مسند احمد سنن ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضورؐ کی حیات میں صحابہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ قرآن کے وظیفے کس طرح کرتے ہیں؟ تو فرمایا کہ پہلی تین سورتوں کی ایک منزل۔ پھر ان کے بعد کی پانچ سورتوں کی دوسری منزل۔ پھر ان کے بعد کی سات سورتوں کی تیسری منزل۔ پھر ان کے بعد کی

دسورتوں کی چوتھی منزل۔ پھر ان کے بعد کی گیارہ سورتوں کی پانچویں منزل۔ پھر اس کے بعد کی تیرہ سورتوں کی چھٹی منزل، اور مفصل کی یعنی سورۂ قٓ سے لیکر آخر تک کی ایک منزل۔

سورت کی لفظی بحث کے بیان میں۔ بعض تو کہتے ہیں کہ اس کے معنی علٰیحدگی بلندی کے ہیں۔ چنانچہ نابغہ کے ایک شعر میں سورۃ کا لفظ اس معنی میں آیا ہے تو اس معنی کا تعلق قرآن کی سورتوں کے ساتھ اس طرح ہوگا کہ گویا قرآن کا پڑھنے والا ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف جاتا رہتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شرافت اور اونچائی کے معنی میں ہے اسی لیۓ شہر پناہ کو عربی میں سُوْر کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ برتن میں جو حصہ باقی رہ جائے اسے عربی میں اِسارہ کہتے ہیں۔ اور سورۃ کا لفظ اسی سے لیا گیا ہے، چونکہ سورۃ بھی قرآن کا ایک حصہ اور ٹکڑا ہوتی ہے۔ ہمزہ کی تخفیف کر دی گئی۔ پھر ہمزہ کو واؤ سے بدل دیا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ سورۃ کے معنی تمام وکمال کے ہیں۔ پوری اونٹنی کو عربی زبان میں سورہ کہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح قلعہ کو عربی میں اس لیے سُوْر کہتے ہیں کہ محلوں اور گھروں کا احاطہ کر لیتا ہے اور انھیں جمع کر لیتا ہے۔ اسی طرح چونکہ آیتوں کو سورت جمع کر لیتی ہے اور ان کا احاطہ کر لیتی ہے اس کو بھی سورۃ کہا گیا۔ سورۃ کی جمع سُوَرٌ آتی ہے اور کبھی سُوَرَاتٌ بھی آتی ہے۔

آیت کو آیت اس وجہ سے کہتے ہیں کہ آیت کے لفظی معنی علامت اور نشان کے ہیں۔ چونکہ آیت پر کلام ختم ہوتا ہے اور اوّل آیت سے جدا ہوتا ہے۔ اس لئے اسے آیت کہتے ہیں۔ قرآن میں بھی آیت علامت اور نشان کے معنی میں ارشاد ہے۔ اِنَّ اٰیَةَ مُلْکِهٖ یعنی اس کے بادشاہ ہونے کی نشانی اور علامت۔ اسی طرح نابغہ کے شعر میں بھی آیت اسی معنی میں ہے اور آیت کے معنی جماعت اور گروہ کے بھی آتے ہیں۔ عرب کے شعروں میں یہ لفظ اس معنی میں بھی آیا ہے چونکہ آیت بھی حروف کی ایک جماعت اور گروہ ہے۔ اس رعایت سے اسے بھی آیت کہتے ہیں اور عایت کے معنی عجیب کے بھی ہیں۔ چونکہ یہ عجیب چیز ہے معجزہ ہے تمام انسان اس جیسی بات نہیں کہہ سکتے۔ اسلئے بھی اسے آیت کہتے ہیں۔ سیبویہ کہتے ہیں کہ اصل میں یہ اَیَیَةٌ تھا جیسے اَکَمَةٌ اور شجرۃٌ پہلی یا عربی کے قاعدے کے مطابق الف بن گئی۔ کسائی کا قول ہے کہ آیت کی اصل اٰیِیَةٌ تھی جیسے اٰمِنَةٌ یا الف ہو گئی اور التباس کی وجہ سے گر گئی۔ فراء کہتے ہیں کہ یہ اصل میں اَیَّیَةٌ تھا۔ پھر تشدید کی وجہ سے الف سے بدل دیا گیا اٰیَةٌ ہو گیا آیت کی جمع اٰیٌ اور اٰیَاتٌ آتی ہے۔

کلمہ کہتے ہیں ایک لفظ کو۔ کبھی تو اس کے دو ہی حرف ہوتے ہیں جیسے مَا اور لَا اور لَهٗ۔ اور کبھی زیادہ بھی ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دس حروف ایک کلمہ میں ہوتے ہیں جیسے لِیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ اور اَنُلْزِمُکُمُوْھَا اور فَاَسْقَیْنٰکُمُوْہُ اور کبھی ایک ہی کلمہ کی ایک آیت ہوتی ہے۔ جیسے وَالْفَجْرِ ۝ اور وَالضُّحٰی ۝ اور وَالْعَصْرِ ۝ اور اسی طرح الٓمّٓ ۝ اور طٰهٰ ۝ اور یٰسٓ ۝ اور حٰمٓ ۝ کوفیوں کے قول میں۔ اور حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ۝ ان کے نزدیک دو کلمے ہیں اور ان کے سوا اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیتیں نہیں بلکہ سورتوں کے شروع ہیں۔ ابو عمرو دانی فرماتے ہیں کہ ایک کلمہ کی آیت قرآن کریم میں سوا مُدْھَآمَّتٰنِ ۝ کے جو سورۂ رحمٰن میں ہے اور کوئی نہیں۔

**فصل** قرطبی فرماتے ہیں کہ عربی زبان کے سوا عجمی ترکیب تو قرآن میں ہے ہی نہیں، البتہ عجمی نام ہیں جیسے ابراہیم۔ نوح۔ لوط۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ کیا قرآن میں اس کے سوا بھی کچھ عجمی ہے تو باقلانی اور طبری نے تو صاف انکار کر دیا ہے اور کہدیا ہے کہ عجمیت کے مطابق جو ہے وہ حقیقت میں عربی ہی ہے لیکن موافقت ہے۔

## تفسیر سورۂ فاتحہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اس سورت کا نام سورۂ فاتحہ ہے۔ فاتحہ کہتے ہیں شروع کرنے کو چونکہ قرآن کریم میں سب سے پہلے یہی سورت لکھی ہے اس لئے اسے سورۂ فاتحہ کہتے ہیں اور اسی لئے بھی کہ

نماز میں قرأت بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا نام اُمُّ الْکِتٰب بھی ہے۔ جمہور یہی کہتے ہیں حسن اور ابن سیرین اس کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں کہ لوح محفوظ کا نام ام الکتاب ہے، اور حسنؒ کا قول ہے کہ محکم آیتوں کو ام الکتاب کہتے ہیں ترمذی کی ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ پوری سورت تک۔ یہی سورت ام القرآن ہے اور ام الکتاب ہے۔ اور سبع مثانی ہے اور قرآن عظیم ہے۔ اس سورت کا نام سورت الحمد اور سورۃ الصلوٰۃ بھی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے میں نے صلوٰۃ کو (یعنی سورۂ فاتحہ کو) اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم کر دیا ہے۔ جب بندہ کہتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی۔ الحدیث۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ کا نام صلوٰۃ بھی ہے۔ اس لئے کہ اس سورت کا نماز میں پڑھنا شرط ہے۔ اس سورت کا نام سورت الشفا بھی ہے۔ دارمی میں حضرت ابوسعید سے مرفوعاً روایت ہے کہ سورۂ فاتحہ ہر زہر کی شفا ہے اور اس کا نام سورت الرقیہ بھی ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب سانپ کے کاٹے ہوئے شخص پر اس سورت کو پڑھ کر دم کیا اور وہ اچھا ہو گیا۔ تب حضورؐ نے ان سے فرمایا تھا۔ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ رقیہ ہے۔ یعنی پڑھ کر پھونکنے کی سورت ہے؟ ابن عباسؓ اسے اساس القرآن کہتے تھے۔ یعنی قرآن کی جڑ اور نیو اور اس سورت کی نیو آیت بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے سفیان بن عُیَیْنَہ فرماتے ہیں کہ اس کا نام وافیہ ہے۔ یحییٰ بن کثیرؒ کہتے ہیں اس کا نام کافیہ بھی ہے اس لئے کہ یہ اپنے ماسوا سے کفایت کرتی ہے اور دوسری کوئی سورت اس سورت سے کفایت نہیں کرتی۔ بعض مرسل حدیثوں میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ ام القرآن سب کے عوض بن سکتی ہے لیکن ام القرآن کا غیر ام القرآن عوض نہیں ہو سکتا۔ اسے سورۃ الصلوٰۃ الکنز بھی کہا گیا ہے۔ زمخشری کی تفسیر کشاف دیکھئے۔ ابن عباسؓ۔ قتادہ ابو العالیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ مجاہدؒ، عطاء بن یسارؒ اور زہریؒ فرماتے ہیں کہ یہ سورت مدنی ہے اور یہ بھی ایک قول ہے کہ یہ سورت دو مرتبہ نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ مکہ میں اور دوبارہ مدینہ میں لیکن پہلا قول ہی زیادہ ٹھیک ہے اس لئے کہ دوسری آیت میں ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ۔ یعنی ہم نے تمہیں سبع مثانی سات آیتیں دہرائی جانے والی دی ہیں۔ واللہ اعلم۔ ابو اللیث سمرقندی کا ایک قول قرطبیؒ نے بھی نقل کیا ہے کہ اس سورت کا نصف تو مکہ شریف میں نازل ہوا اور آخری آدھا حصہ مدینہ شریف میں نازل ہوا لیکن یہ قول بالکل غریب ہے۔

اس کی آیتوں کی نسبت اتفاق ہے کہ سات ہیں لیکن عمرو بن عبید نے آٹھ اور حسین جعفی نے چھ بھی کہی ہیں اور یہ دونوں قول شاذ ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اس سورت کی مستقل آیت ہے یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ تمام کوفی قاری اور صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت اور پچھلے بہت سارے بزرگ تو اسے سورۂ فاتحہ کی اول کی ایک پوری اور مستقل آیت کہتے ہیں بعض اسے اس کا جزو مانتے ہیں اور بعض سرے سے اس آیت کو اس کے شروع میں مانتے ہی نہیں جیسا کہ مدینہ شریف کے قاریوں اور فقیہوں کے یہ تینوں قول ہیں۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔ اس سورت کے کلمات پچیس ۲۵ ہیں اور حروف ایک سو تیرہ ۱۱۳ ہیں۔ امام بخاری کتاب التفسیر کے شروع میں صحیح بخاری میں لکھتے ہیں۔ ام الکتاب اس سورت کا نام اسلئے ہے کہ قرآن شریف کی کتابت اس سے شروع ہوتی ہے۔ اور نماز کی قرأت بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ چونکہ تمام قرآن شریف کے مضامین اجمالی طور پر اس میں ہیں اسلئے اس کا نام ام الکتاب ہے اور عرب کی عادت ہے کہ ہر ایک جامع کام اور کام کی جڑ کو جس کی شاخیں اور اجزا اسی کے تابع ہوں ام کہتے ہیں۔ دیکھئے ام الرأس وہ اس جلد کو کہتے ہیں جو دماغ کی جامع ہے اور لشکری جھنڈے اور نشان کو بھی جس کے نیچے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ام کہتے ہیں شعراء کے اشعار میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے مکہ شریف کو ام القریٰ کہنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ہے اور سب کا جامع ہے۔ زمین وہیں سے پھیلائی گئی ہے۔

چونکہ اس سے نماز کی قرارت شروع ہوتی ہے اور قرآن شریف کے لکھنے کے وقت بھی صحابہؓ نے اسی کو پہلے لکھا۔ اس لئے اسے فاتحہ بھی کہتے ہیں اس کا ایک نام صحیح سبع مثانی بھی ہے۔ اس لئے کہ وہ بار بار نماز میں پڑھی جاتی ہے۔ ہر رکعت میں اسے پڑھا جاتا ہے اور مثانی کے معنی اور بھی ہیں جو انشاء اللہ تعالیٰ اپنی جگہ بیان ہوں گے۔ واللہ اعلم۔ مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّ القرآن کے بارے میں فرمایا یہ اُمّ القرآن ہے۔ یہی سبع مثانی ہے اور یہی قرآن عظیم ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے۔ یہی ام القرآن ہے۔ یہی فاتحۃ الکتاب ہے اور یہی سبع مثانی ہے۔ تفسیر مردویہ میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ کی سات آیتیں ہیں۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بھی ان میں سے ایک آیت ہے اسی کا نام سبع مثانی ہے۔ یہی قرآن عظیم ہے۔ یہی ام الکتاب ہے۔ یہی فاتحۃ الکتاب ہے۔ دارقطنی میں بھی اسی طرح کی حدیث ہے اور بقول امام دارقطنی اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ بیہقی میں ہے کہ حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ نے سبع مثانی کی تفسیر میں یہی کہا ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ ہے اور بسم اللہ الخ اس کی ساتویں آیت ہے۔ بسم اللہ کی بحث میں یہ بیان پورا آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت ابن مسعودؓ سے کہا گیا کہ آپ نے سورۂ فاتحہ کو اپنے لکھے ہوئے قرآن شریف کے شروع میں کیوں نہیں لکھا؟ تو کہا اگر میں لکھتا تو پھر ہر سورت کے پہلے اس کو لکھتا۔ ابوبکر بن داؤدؒ فرماتے ہیں۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں پڑھے جانے کی حیثیت سے اور چونکہ تمام مسلمانوں کو حفظ ہے اس لئے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں دلائل النبوت میں امام بیہقیؒ نے ایک حدیث کی تخریج کی ہے۔ جس میں ہے کہ یہ سورت سب سے پہلے نازل ہوئی۔ باقلانی نے نقل کیا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ سب سے پہلے نازل ہوئی اور دوسرا قول یہ ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ سب سے پہلے نازل ہوئی جیسا کہ صحیح حدیث میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ نازل ہوئی اور یہی صحیح ہے اس کی تفصیل آگے آئے گی انشاء اللہ۔

## سورۂ فاتحہ کی فضیلت

مسند احمد میں حضرت ابوسعید بن معلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب نماز سے فارغ ہو کر میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا اب تک کس کام میں تھے؟ میں نے کہا حضور میں نماز میں تھا۔ آپ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تم نے نہیں سنا؟ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ اے ایمان والو! اللہ کے رسول جب تمہیں پکاریں تم جواب دو۔ اچھا سنو! میں تمہیں مسجد میں جانے سے پہلے ہی بتلا دوں گا کہ قرآن پاک میں سب سے بڑی سورت کونسی ہے! پھر میرا ہاتھ پکڑے ہوئے جب آپ نے مسجد سے جانے کا ارادہ کیا تو میں نے وعدہ یاد دلایا۔ آپ نے فرمایا وہ سورت اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ ہے یہی سبع مثانی ہے اور یہی وہ قرآن عظیم ہے جو مجھ کو دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ روایت صحیح بخاری شریف، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی دوسری سندوں کے ساتھ ہے۔ واقدی نے یہ واقعہ حضرت اُبی بن کعبؓ کا بیان کیا ہے۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبی بن کعبؓ کو آواز دی وہ نماز میں تھے فارغ ہو کر آپ سے ملے فرماتے ہیں کہ آپ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رکھا۔ مسجد سے باہر نکل ہی رہے تھے کہ فرمایا میں چاہتا ہوں کہ مسجد سے نکلنے سے پہلے میں تجھے ایسی ایک سورت بتاؤں کہ توراۃ انجیل اور قرآن میں اس کے مثل نہیں۔ اب میں نے اس امید پر آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ اور پوچھا حضورؐ وہ سورت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا نماز کے شروع میں تم کیا پڑھتے ہو؟ میں نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ پوری سورت ختم تک۔ آپؐ نے فرمایا وہ یہی سورت ہے۔ سبع مثانی اور قرآن عظیم جو مجھے دیا گیا ہے وہ بھی یہی ہے۔ اس حدیث کے آخری راوی ابوسعیدؓ ہیں اس بنا پر ابن اثیر اور ان کے ساتھ والے یہاں دھوکا کھا گئے ہیں وہ انہیں ابوسعید بن معلی سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ ابوسعید دوسرے ہیں یہ مولیٰ خزاعی ہیں اور تابعین میں سے ہیں اور وہ ابوسعید

انصاری صحابی رضؓ ہیں۔ ان کی حدیث متصل اور صحیح ہے اور یہ حدیث ظاہر میں منقطع معلوم ہوتی ہے۔ اگر ابوسعید تابعی کا حضرت ابیؓ سے سننا ثابت نہ ہو اور اگر سنا ہو تو یہ حدیث شرط مسلم پر ہے۔ واللہ اعلم۔ اس حدیث کے اور بھی بہت سے طرق ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ حضورؐ نے جب انہیں پکارا تو یہ نماز میں تھے۔ التفات کیا مگر جواب نہ دیا۔ آپؐ نے پھر پکارا۔ حضرت ابیؓ نے نماز ہلکی کر دی اور فارغ ہو کر جلدی سے حاضر خدمت ہوئے۔ سلام علیک عرض کیا۔ آپؐ نے جواب دیکر فرمایا ابیؓ تم نے مجھے جواب کیوں نہ دیا؟ کہا حضورؐ میں نماز میں تھا۔ آپؐ نے وہی آیت پڑھ کر فرمایا کیا تم نے یہ آیت نہیں سنی؟ کہا حضور قصور ہوا اب ایسا نہ کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں ایک ایسی سورت بتا دوں کہ توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن میں اس جیسی سورت نہیں؟ کہا ضرور ارشاد فرمایئے۔ آپؐ نے فرمایا یہاں سے جانے سے پہلے ہی میں تمہیں بتا دوں گا۔ پھر حضورؐ میرا ہاتھ تھامے ہوئے دوسری باتیں کرتے رہے اور میں نے اپنی رفتار دھیمی کر دی کہ ایسا نہ ہو وہ بات رہ جائے اور آپؐ باہر چلے جائیں۔ آخر جب دروازے کے قریب پہنچ گئے تو میں نے آپ کو وعدہ یاد دلایا۔ آپ نے فرمایا نماز میں کیا پڑھتے ہو؟ میں نے ام القرآن پڑھ کر سنائی۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن میں اس جیسی کوئی اور سورت نہیں۔ یہ سبع مثانی ہے۔ ترمذی میں اتنی زیادتی اور بھی ہے کہ یہی وہ بڑا قرآن ہے جو مجھے عطا فرمایا گیا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت انسؓ سے بھی اس باب میں ایک حدیث مروی ہے۔ مسند احمد کی ایک مطول حدیث میں بھی اسی طرح مروی ہے۔ نسائی کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ یہ سورت اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان تقسیم کر دی گئی ہے۔ ترمذی اسے حسن غریب کہتے ہیں۔ مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپؐ اس وقت استنجے سے فارغ ہوئے ہی تھے۔ میں نے تین مرتبہ سلام کیا، لیکن آپ نے ایک دفعہ بھی جواب نہ دیا۔ اب آپؐ تو گھر میں تشریف لے گئے، میں غم و رنج کی حالت میں مسجد میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں آپ طہارت کر کے تشریف لائے اور تین مرتبہ میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر فرمایا اے عبداللہ بن جابرؓ سنو تمام قرآن میں بہترین سورت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الخ ہے۔ اس کے اسناد بہت عمدہ ہے۔ ابن عقیل جو اس کا راوی ہے اس کی حدیث بڑے بڑے ائمہ روایت کرتے ہیں اور یہ جابر عبداللہ سے مراد عبدی صحابیؓ ہیں۔ ابن الجوزی کا یہی قول ہے واللہ اعلم۔ حافظ ابن عساکرؒ کا قول ہے کہ یہ عبداللہ بن جابر انصاری بیاضیؓ ہیں۔

یہ حدیث اور اس جیسی اور احادیث سے استدلال کر کے ابن راہویہ ابوبکر بن عربی ابن الحصار وغیرہ اکثر علماء نے کہا ہے کہ بعض آیتیں اور بعض سورتیں بعض پر فضیلت رکھتی ہیں اور ایک دوسری جماعت کا خیال ہے کہ کلام اللہ کُل کا کُل برابر ہے ایک کو ایک پر فضیلت دینے سے یہ قباحت ہو گی کہ دوسری آیتیں اور سورتیں اس سے کم درجہ کی نظر آئیں گی۔ حالانکہ کلام اللہ سارا کا سارا فضیلت والا ہے۔ قرطبی نے اشعری اور ابوبکر باقلانی اور ابوحاتم ابن حبان بستی اور ابوحبان اور یحییٰ بن یحییٰ سے یہی نقل کیا ہے۔ امام مالکؒ سے بھی ایک روایت میں یہ مذہب منقول ہے (لیکن صحیح اور مطابق حدیث پہلا قول ہے واللہ اعلم - مترجم)

سورۂ فاتحہ کے فضائل میں مندرجہ بالا حدیثوں کے علاوہ اور حدیثیں بھی ہیں۔ صحیح بخاری شریف فضائل القرآن میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، ہم ایک مرتبہ سفر میں تھے ایک جگہ اترے ہوئے تھے۔ ناگہاں ایک لونڈی آئی اور کہا کہ یہاں کے قبیلہ کے سردار کو سانپ نے کاٹ کھایا ہے۔ ہمارے آدمی یہاں موجود نہیں۔ آپ میں سے کوئی ایسا ہے کہ جھاڑ پھونک کر دے؟ ہم میں سے ایک شخص اٹھ کر ساتھ ہو لیا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ کچھ جھاڑ پھونک بھی جانتا ہے۔ اس نے وہاں جا کر کچھ پڑھ کر دم کیا، خدا کے فضل سے وہ بالکل اچھا ہو گیا۔ تیس بکریاں اس نے دیں اور ہماری مہمانی کے لئے دودھ بھی بہت سارا بھیجا۔ جب وہ واپس آئے تو ہم نے کہا کہ تم کو اس کا علم یاد تھا؟ اس نے کہا میں نے تو صرف سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا ہے۔ ہم نے کہا اس آئے ہوئے مال کو

ابھی نہ چھیڑو پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھ لو مدینہ میں آکر ہم نے حضور سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ پڑھ کر دم کرنے کی سورت ہے؟ اس مال کے حصے کرو میرا بھی ایک حصہ لگانا۔ صحیح مسلم شریف اور ابوداؤد میں بھی یہ حدیث ہے مسلم کی بعض روایتوں میں ہے کہ دم کرنے والے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی تھے۔ مسلم اور نسائی میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے کہ اوپر سے ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی جبرئیل علیہ السلام نے اوپر دیکھ کر فرمایا۔ آج آسمان کا وہ دروازہ کھلا ہے جو کبھی نہیں کھلا تھا۔ پھر وہاں سے ایک فرشتہ حضور کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے۔ خوش ہو جایئے۔ دو نور آپ کو ایسے دیئے گئے ہیں کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں۔ ایک ایک حرف پر ان میں سے نور ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص نماز میں امّ القرآن نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، ناقص ہے پوری نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ جب ہم امام کے پیچھے ہوں تو؟ فرمایا پھر بھی چپکے چپکے پڑھ لیا کرو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھوں آدھ کر دیا ہے اور میرا بندہ مجھ سے جو مانگتا ہے وہ میں دیتا ہوں۔ جب بندہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ۔ میرے بندے نے میری تعریف کی۔ پھر بندہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَثْنٰى عَلَیَّ عَبْدِیْ میرے بندے نے میری ثنا بیان کی۔ پھر بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ یعنی میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ بعض روایتوں میں ہے اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے فَوَّضَ اِلَیَّ عَبْدِیْ یعنی میرے بندے نے میرے سپرد کر دیا۔ پھر بندہ کہتا ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' یہ ہے میرے اور میرے بندے کے درمیان اور میرے بندے کے درمیان اور میرا بندہ مجھ سے جو مانگے گا میں دوں گا۔ پھر بندہ آخر سورت تک پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یہ سب میرے بندے کے لئے ہے اور یہ جو مانگیگا وہ اس کے لئے ہے۔ نسائی میں یہ روایت ہے بعض روایات کے الفاظ میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ابوذرعہ نے انھیں صحیح کہا ہے۔ مسند احمد میں بھی یہ حدیث مطوّل موجود ہے۔ اسکے راوی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں ابن جریر کی ایک روایت میں اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے لئے ہے اور جو باقی ہے میرے بندے کے لئے ہے۔ یہ حدیث غریب ہے۔

## فوائد حدیث

اب اس حدیث کے فائدوں پر نظر ڈالئے۔ اوّل اس حدیث میں لفظ صلوٰۃ یعنی نماز کا اطلاق ہے اور مراد اس سے قراۃ ہے۔ جیسے کہ قرآن میں اور جگہ پر ہے وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ الخ یعنی اپنی نماز (یعنی قراۃ) کو نہ تو بہت بلند آواز سے پڑھو نہ بہت پست آواز سے بلکہ درمیانی آواز سے پڑھا کرو۔ ابن عباسؓ سے اس کی تفسیر میں صراحت سے مروی ہے کہ یہاں صلوٰۃ سے مراد قراۃ ہے اور اسی طرح مندرجہ بالا حدیث میں قراۃ کو صلوٰۃ کہا ہے۔ اس سے نماز میں قراۃ کی جو عظمت ہے وہ معلوم ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ قراۃ نماز کا اعلیٰ رکن ہے اس لئے کہ عبادت کا مطلق نام لیا گیا اور اس کے ایک جزو یعنی قراۃ کا ارادہ کیا گیا۔ یہ بھی خیال رہے کہ اس کے برخلاف ایسا بھی ہوا ہے کہ قراۃ کا اطلاق کیا گیا اور مراد نماز لی گئی۔ فرمان ہے وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ الخ یعنی صبح کے قرآن پر فرشتے حاضر کئے جاتے ہیں۔ یہاں مراد قرآن سے نماز ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ فجر کی نماز کے وقت رات کے اور دن کے فرشتے جمع ہو جاتے ہیں ان آیات واحادیث سے یہ معلوم ہوا کہ نماز میں قراۃ کا پڑھنا ضروری ہے اور علماء کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ دوم اس میں اختلاف ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہی ضروری ہے یا قرآن میں سے جو کچھ پڑھ لے وہ کافی ہے؟ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے ساتھی وغیرہ تو کہتے ہیں کہ اسی کا پڑھنا متعین نہیں، بلکہ قرآن میں سے جو کچھ پڑھ لیگا کافی ہوگا ان کی دلیل آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ہے یعنی قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھ لو۔ صحیحین کی حدیث ہے

جس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے جو نماز کو جلدی جلدی پڑھ رہا تھا، فرمایا جب تو نماز کیلئے کھڑا ہو تو تکبیر کہہ پھر جو قرآن میں سے تجھے آسان نظر آئے پڑھ۔ وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا اس شخص کو یہ فرمانا اور سورۂ فاتحہ کی تعین نہ کرنا بتا رہا ہے کہ جو کچھ قرآن پڑھ لے کافی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ہی کا پڑھنا ضروری ہے۔ اور اس کے پڑھے بغیر نماز نہ ہوگی۔ ان کے علاوہ اور سب ائمہ کرام کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے سبکے سب شاگرد وغیرہ اور جمہور علماء کرام کا یہی فرمان ہے۔ ان کی دلیل یہ حدیث شریف ہے جو اللہ کے رسول نے اللہ تعالیٰ ان پر درود و رحمت بھیجے بیان فرمائی ہے کہ جو شخص نماز پڑھے خواہ کوئی نماز ہو اور اس میں ام القرآن نہ پڑھے وہ نماز ناقص ہے پوری نہیں۔ اسی طرح ان بزرگوں کی یہ دلیل بھی ہے جو صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص سورۂ فاتحہ کو نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہے۔ صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبّان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ نماز نہیں ہوتی جس میں اُم القرآن نہ پڑھی جائے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ ہمیں یہاں پر مناظرانہ پہلو اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں وہ بہت لمبی بحثیں ہیں۔ ہم نے تو مختصراً ان بزرگوں کی دلیلیں بیان کردیں۔ اب یہ بھی سن لیجئے کہ امام شافعیؒ وغیرہ علماء کرام کی ایک بڑی جماعت کا تو یہ مذہب ہے کہ سورۂ فاتحہ کا ہر رکعت میں پڑھنا واجب ہے، اور لوگ کہتے ہیں کہ اکثر رکعتوں میں پڑھنا واجب ہے۔ حسن اور اکثر بصرے کے لوگ کہتے ہیں نمازوں میں سے کسی ایک رکعت میں اس کا پڑھ لینا واجب ہے اس لیے کہ حدیث میں نماز کا ذکر مطلق ہے۔ ابو حنیفہؒ ان کے ساتھی ثوریؒ اور اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اس کا پڑھنا متعین ہی نہیں، بلکہ اور کچھ بھی پڑھ لے تو کافی ہے، کیونکہ قرآن میں مَا تَیَسَّرَ کا لفظ ہے۔ واللہ اعلم لیکن یہ خیال رہے کہ ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ جو شخص فرض وغیرہ نماز کی ہر ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور سورت نہ پڑھے اسکی نماز نہیں۔ البتہ اس حدیث کی صحت میں نظر ہے اور ان سب باتوں کی تفصیل کا موقعہ احکام کی بڑی بڑی کتابیں ہیں۔ واللہ علم۔ سوم مقتدی پر سورۂ فاتحہ کے واجب ہونیکے مسئلے میں علماء کے تین قول ہیں ایک تو یہ کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا جس طرح امام پر واجب ہے اسی طرح مقتدی پر بھی واجب ہے۔ اسکی دلیل وہ عام حدیثیں ہیں جو ابھی دوسرے فائدے کے بیان میں گذر چکیں دوسرا یہ کہ سرے سے مقتدی کے ذمہ قرأۃ واجب ہی نہیں نہ یہ سورت نہ کچھ اور۔ نہ جہری نماز میں نہ سری نماز میں۔ اسکی دلیل مسند احمد کی یہ حدیث ہے جس میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس کا امام ہو تو امام کی قرأۃ اسکی قرأۃ ہے۔ لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔ اور یہ خود حضرت جابرؓ کے قول سے مروی ہے گو اس مرفوع حدیث کی اور سندیں بھی ہیں۔ لیکن کوئی سند صحیح نہیں۔ واللہ اعلم تیسرا قول یہ ہے کہ جن نمازوں میں امام آہستگی سے قرأۃ کرے ان میں تو مقتدی پر قرأۃ واجب ہے، لیکن جن نمازوں میں اونچی قرأۃ پڑھی جاتی ہے ان میں واجب نہیں۔ اسکی دلیل صحیح مسلم والی حدیث ہے کہ امام اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اسکی اقتداء کی جائے اسکی تکبیر سنکر تکبیر کہو اور جب وہ پڑھے تم چپ رہو۔ سنن میں بھی یہ حدیث ہے۔ امام مسلم نے اس کی تصحیح کی ہے۔ امام شافعی کا پہلا قول بھی یہی ہے اور امام احمدؒ سے بھی ایک روایت ہے۔

ہماری غرض ان مسائل کو یہاں بیان کرنے سے یہ ہیکہ سورۂ فاتحہ کیساتھ احکام کا جس قدر تعلق ہے کسی اور سورت کے ساتھ نہیں۔ مسند بزار میں حدیث ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ جب تم بستر پر لیٹو اور سورۂ فاتحہ اور سورۂ قُلْ ھُوَ اللہ پڑھ لو تو موت کے سوا ہر چیز سے امن میں آگئے۔

# اعوذ باللہ کی تفسیر اور اس کے احکام

قرآن پاک میں ہے خُذِ الْعَفْوَ الخ یعنی درگذر کرنے کی عادت رکھو۔ بھلائی کا حکم کیا کرو اور جاہلوں سے منہ موڑ لیا کرو۔ اگر شیطان کیطرف سے کوئی وسوسہ آجائے تو اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے سے پناہ طلب کیا کرو اور جگہ فرمایا اِدْفَعْ بِالَّتِیْ الخ برائی کو بھلائی سے ٹال دو۔ ہم ان کے بیانات کو خوب جانتے ہیں۔ کہا کرو کہ خدایا شیطان کے وسوسوں اور ان کی حاضری سے ہم تیری پناہ چاہتے ہیں۔ اور جگہ ارشاد ہوتا ہے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ الخ یعنی بھلائی کے ساتھ دفع کرو۔ تم میں اور جس دوسرے شخص میں عداوت ہوگی وہ ایسا ہو جائیگا جیسے دلی دوست۔ یہ کام صبر کرنیوالوں اور خوش قسمتوں کا ہے۔ جب شیطانی وسوسہ آجائے تو اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے سے پناہ چاہو۔ یہ تین آیتیں ہیں اور اس معنی کی کوئی اور آیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں حکم فرمایا ہے کہ انسانوں میں سے جو تمہاری دشمنی کرے اس کی دشمنی کا علاج تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ سلوک و احسان کرو تاکہ اس کی انصاف پسند طبیعت خود اُسے شرمندہ کرے اور وہ تمہاری دشمنی سے نہ صرف باز رہے، بلکہ تمہارا بہترین دوست بن جائے اور شیاطین کی دشمنی سے محفوظ رہنے کے لیئے اُس نے اپنی پناہ پکڑنی سکھائی۔ کیونکہ یہ پلید دشمن سلوک اور احسان سے بھی قبضہ میں نہیں آتا۔ اسے تو انسان کی تباہی اور بربادی میں ہی مزہ آتا ہے اور اس کی پرانی عداوت باوا آدمؑ کے وقت سے ہے۔ قرآن فرماتا ہے۔ اے بنی آدم دیکھو کہیں شیطان تمہیں بھی بہکا نہ دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ اور جگہ فرمایا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے اُسے دشمن ہی سمجھو۔ اس کی جماعت کی تمنا ہی آرزو ہے کہ تم جہنمی ہو جاؤ۔ اور جگہ فرمایا کیا تم اس شیطان کی اور اس کی ذریات کی دوستی کرتے ہو مجھے چھوڑ کر؟ وہ تو تمہارا دشمن ہے۔ یاد رکھو ظالموں کے لیے بُرا بدلہ ہے۔ یہی ہے جس نے قسم کھا کر ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام سے کہا تھا کہ میں تمہارا خیرخواہ ہوں تو اب خیال کر لیجئے کہ ہمارے ساتھ اس کا کیا معاملہ ہوگا؟ ہمارے لیئے تو وہ حلف اٹھا کر آیا ہے کہ عزت خداوندی کی قسم میں ان سب کو بہکاؤں گا۔ ہاں ان میں سے جو مخلص بندے ہیں وہ محفوظ رہ جائیں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ جب قرآن کی تلاوت کرو تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کر لیا کرو شیطان راندے ہوئے سے۔ ایماندار توکل والوں پر اس کا کوئی زور نہیں۔ اس کا زور تو انہی پر ہے جو اس سے دوستی رکھیں اور خدا کے شرک کریں۔

قاریوں کی ایک جماعت تو کہتی ہے کہ قرآن پڑھ چکنے کے بعد اَعُوْذُ الخ پڑھنی چاہیئے۔ اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو قرآن کے طرز بیان پر عمل۔ دوسرے عبادت کے بعد کے غرور کا توڑ۔ ابو حاتم سجستانی نے اور ابن فلوفا نے حمزہ کا یہی مذہب نقل کیا ہے جیسے کہ ابوالقاسم یوسف بن علی بن جنادہ نے اپنی کتاب العبادۃ الکامل میں بیان کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے بھی یہی مروی ہے لیکن اسناد غریب ہے۔ رازی نے اپنی تفسیر میں اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ابراہیم نخعی داؤد ظاہری کا بھی یہی قول ہے۔ قرطبی نے امام مالک کا مذہب بھی یہی بیان کیا ہے، لیکن ابن العربی اسے غریب کہتے ہیں۔ ایک مذہب یہ بھی ہے کہ اوّل آخر دونوں مرتبہ اَعُوْذُ الخ پڑھے تاکہ دونوں دلیلیں جمع ہو جائیں اور جمہور علماء کا مشہور مذہب یہ ہے کہ تلاوت سے پہلے اعوذ پڑھنا چاہیئے تاکہ وسوسے دور ہو جائیں تو ان بزرگوں کے نزدیک آیت کے معنی "جب پڑھے تو" یعنی "جب پڑھنا چاہے تو" ہو جائیں گے۔ جیسے کہ آیت اِذَا قُمْتُمْ الخ یعنی جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو" (تو وضو کر لیا کرو) کے معنی جب تم نماز کے لیئے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو ہیں۔ حدیثوں کی رو سے بھی یہی معنی ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر نماز شروع کرتے پھر سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ تین مرتبہ پڑھکر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھتے۔ پھر فرماتے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ سنن اربع میں بھی یہ حدیث ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں اس باب میں سب سے زیادہ مشہور یہی ہے

ہمزہ کے معنی گلا گھونٹنے کے اور نفخ کے تکبر کے اور نفث کے معنی شعر گوئی کے ہیں۔ ابن ماجہ کی ایک روایت میں یہی معنی بیان کئے گئے ہیں اور اس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں داخل ہوتے ہی تین مرتبہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا، تین مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا اور تین مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا پڑھتے۔ پھر یہ پڑھتے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الشَّیْطَانِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ ابن ماجہ میں اور سند کے ساتھ یہ روایت مختصر بھی آئی ہے۔ مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ آپ پہلے تین مرتبہ تکبیر کہتے پھر تین مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ کہتے پھر اَعُوْذُ بِاللّٰہِ آخر تک پڑھتے۔ مسند ابو یعلی میں ہے کہ حضورؐ کے سامنے دو شخص لڑنے جھگڑنے لگے۔ غصہ کے مارے ایک کے نتھنے پھول گئے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ۝ کہہ لے تو اس کا غصہ ابھی جاتا رہے۔ نسائی نے اپنی کتاب الیوم واللیلہ میں بھی اسے روایت کیا ہے۔ مسند احمد ابوداؤد، ترمذی میں بھی یہ حدیث ہے۔ اس کی ایک روایت میں اتنی زیادتی اور بھی ہے کہ حضرت معاذؓ نے اس شخص سے اس کے پڑھنے کو کہا، لیکن اس نے نہ پڑھا اور اس کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ زیادتی والی روایت مرسل ہے۔ اس لیئے کہ عبدالرحمن بن ابو لیلی جو حضرت معاذؓ سے اسے روایت کرتے ہیں ان کا حضرت معاذؓ سے ملاقات کرنا ثابت نہیں، بلکہ یہ بیس برس پہلے فوت ہو چکے تھے۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ شاید عبدالرحمن نے حضرت اُبی بن کعبؓ سے سنا ہو۔ وہ بھی اس حدیث کے راوی ہیں اور اسے حضرت معاذؓ تک یہ پہنچایا ہو۔ کیونکہ اس واقعہ کے وقت تو بہت سے صحابہؓ موجود تھے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، نسائی میں بھی مختلف سندوں سے مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث مروی ہے۔ استغاثہ کے متعلق اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں یہاں سب کو بیان کرنے سے طول ہوگا۔ ان کے بیان کے لیے اذکار و وظائف کی اور فضائل اعمال کے بیان کی کتابیں ہیں۔ واللہ اعلم

ایک روایت میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام جب سب سے پہلے وحی لیکر حضورؐ کے پاس آئے تو پہلے اَعُوْذُ پڑھنے کا حکم دیا۔

تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ پہلے پہل حضرت جبرئیل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئے تو فرمایا اَعُوْذُ پڑھیئے۔ آپ نے فرمایا اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ پھر جبرئیل علیہ السلام نے کہا، کہیئے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پھر کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں سب سے پہلے سورت جو اللہ تعالی نے جبرئیل علیہ السلام کی معرفت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی یہی ہے۔ لیکن یہ اثر غریب ہے اور اس کی اسناد میں ضعف اور انقطاع ہے۔ ہم نے اسے صرف اس لیئے بیان کیا ہے کہ معلوم رہے۔ واللہ اعلم

**مسئلہ ۱۔** جمہور علماء کا قول ہے کہ اعوذ پڑھنا مستحب ہے۔ واجب نہیں کہ اس کے نہ پڑھنے سے گناہ ہو۔ عطاء بن ابو رباحؒ کا قول ہے کہ جب کبھی قرآن پڑھے استعاذہ کا پڑھنا واجب ہے۔ خواہ نماز میں ہو خواہ غیر نماز میں۔ امام رازیؒ نے یہ قول نقل کیا ہے۔ ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ عمر بھر صرف ایک مرتبہ پڑھ لینے سے وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ حضرت عطاء کے قول کی دلیل آیت کے ظاہری الفاظ ہیں کیونکہ اس میں فَاسْتَعِذْ امر ہے اور عربیت کے قواعد کے لحاظ سے امر وجوب کیلئے ہوتا ہے۔ اسی طرح حضورؐ کا اس پر ہمیشگی کرنا بھی وجوب کی دلیل ہے اور اس سے شیطان کا شر دور ہوتا ہے اور اس کا دور کرنا واجب ہے اور جس چیز سے واجب پورا ہوتا ہو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے اور استعاذہ زیادہ احتیاط والا ہے اور وجوب کا ایک طریقہ یہی ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اعوذ پڑھنا حضورؐ پر واجب تھا۔ آپ کی اُمت پر واجب نہیں۔ امام مالکؒ سے یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ فرض نماز میں اعوذ پڑھے اور رمضان شریف کی اول رات کی نماز میں اعوذ پڑھ لے۔

**مسئلہ ۲۔** امام شافعیؒ املا میں لکھتے ہیں کہ اعوذ زور سے پڑھے اور اگر پوشیدہ پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں اور امام حنبلؒ لکھتے ہیں کہ بلند آہستہ پڑھنے میں اختیار ہے اس لیئے کہ حضرت ابن عمرؓ سے پوشیدہ پڑھنا اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اونچی آواز سے پڑھنا ثابت ہے۔ پہلی رکعت کے سوا اور رکعتوں میں اعوذ پڑھنے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں۔ ایک مستحب ہونیکا اور دوسرا مستحب نہ ہونیکا اور

ترجیح دوسرے قول کو ہی ہے۔ واللہ اعلم۔ صرف اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ہ کہہ لینا امام شافعی اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تو کافی ہے۔ لیکن بعض کہتے ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔ پڑھے اور بعض کہتے ہیں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ہ پڑھے ثوری اور اوزاعیؒ کا یہی مذہب ہے۔ بعض کہتے ہیں اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ہ پڑھے تاکہ آیت کے پورے الفاظ پر عمل ہوجائے اور ابن عباسؓ کی حدیث پر بھی عمل ہوجائے۔ جو پہلے گذر چکی۔ لیکن جو صحیح حدیثیں پہلے گذر چکیں وہی اتباع میں اولیٰ ہیں۔ واللہ اعلم۔ نماز میں اعوذ کا پڑھنا ابوحنیفہ اور محمد کے نزدیک تو تلاوت کیلئے ہے۔ اور ابو یوسف کے نزدیک نماز کیلئے ہے تو مقتدی کو بھی پڑھ لینا چاہئیے اگرچہ وہ قرأت نہیں پڑھے گا اور عید کی نماز میں بھی پہلی تکبیر کے بعد پڑھ لینا چاہئیے۔ جمہور کا مذہب ہے کہ عید کی تکبیریں کل کہہ کر پھر اعوذ پڑھے پھر قرأت پڑھے۔ اعوذ میں عجیب وغریب فوائد ہیں۔ واہی تباہی باتوں سے منہ میں جو ناپاکی ہوتی ہے وہ اس سے دور ہوجاتی ہے اور منہ کلام اللہ کی تلاوت کے قابل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس میں اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کرنی ہے اور اس کی عظیم الشان قدرتوں کا اقرار کرنا ہے اور اس باطنی کھلے ہوئے دشمن کے مقابلہ میں اپنی کمزوری اور عاجزی کا اقرار ہے۔ کیونکہ انسانی دشمن کا مقابلہ ہوسکتا ہے۔ احسان اور سلوک سے اس کی دشمنی دفع ہوسکتی ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک کی ان تین آیتوں میں ہے جو پہلے بیان ہوچکی ہیں اور جگہ ارشاد خداوندی ہے اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ الخ یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں۔ رب کی وکالت کافی ہے اللہ تعالیٰ نے دشمنانِ اسلام کے مقابلہ پر اپنے پاک فرشتے بھیجے اور انہیں نیچا دکھا دیا۔ یہ یاد رکھنے کے قابل امر ہے کہ جو مسلمان کافروں کے ہاتھ سے مارا جائے وہ شہید ہے۔ لیکن جو اس باطنی دشمن شیطان کے ہاتھ سے مارا جائے وہ راندہ درگاہ ہے۔ جس پر کفار غالب آجائیں وہ اجر پاتا ہے۔ لیکن جس پر شیطان غالب آجائے وہ ہلاک و برباد ہوتا ہے۔ چونکہ شیطان انسان کو دیکھتا ہے اور انسان اسے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیئے قرآنی تعلیم ہوئی کہ تم اس کے شر سے اس کی پناہ چاہو جو اسے دیکھتا ہے اور یہ اُسے نہیں دیکھ سکتا۔

**فصل ا**۔ اعوذ پڑھنا اللہ تعالیٰ کی طرف التجا کرنا ہے اور ہر برائی والے کی برائی سے اس کے دامن میں پناہ طلب کرنا ہے۔ عیاذہ کے معنی برائی کے دفع کرنے کے ہیں اور لیاذہ کے معنی بھلائی حاصل کرنے کے ہیں۔ متنبی کا شعر ہے ؎

يَا مَنْ اَلُوْذُ بِهٖ فِيْ مَا اُؤَمِّلُهٗ + وَمَنْ اَعُوْذُ بِهٖ مِمَّا اُحَاذِرُهٗ + لَا يَجْبُرُ النَّاسُ عَظْمًا اَنْتَ كَاسِرُهٗ + وَلَا يَهِيْضُوْنَ عَظْمًا اَنْتَ جَابِرُهٗ

اے وہ پاک ذات جس کی ذات سے میری تمام اُمیدیں وابستہ ہیں اور اے وہ پروردگار کہ تمام برائیوں سے میں اس کی پناہ پکڑتا ہوں جسے وہ توڑ دے اُسے کوئی جوڑ نہیں سکتا اور جسے وہ جوڑ دے اُسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ اعوذ کے معنے یہ ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ شیطان رجیم مجھے دین و دنیا میں کوئی ضرر نہ پہنچا سکے جن احکام کی بجاآوری کا مجھے حکم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں اس سے رک جاؤں اور جن کاموں سے میں منع کیا گیا ہوں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے وہ بد افعال سرزد ہو جائیں۔ یہ ظاہر ہے کہ شیطان سے بچانیوالا سوا خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔ اسی لیے پروردگارِ عالم نے انسانوں کے شر سے محفوظ رہنے کی تو ترکیب سلوک و احسان وغیرہ بتلائی اور شیطان کے شر سے بچنے کی صورت یہ بتلائی کہ ہم اس کی ذات پاک کے پناہ طلب کریں۔ اس لیے کہ نہ تو اسے رشوت دی جائے نہ وہ بھلائی اور سلوک کی وجہ سے اپنی شرارت سے باز آئے اس کی برائی سے بچانے والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تینوں پہلی آیتوں میں یہ مضمون گذر چکا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ خُذِ الْعَفْوَ الخ اور سورہ مومنون میں ہے۔ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ الخ اور سورۂ سجدے میں ہے۔ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ الخ ان تینوں آیتوں کا مفصل بیان اور ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

لفظ شیطان شَطَنَ سے بنا ہے اسکے لفظی معنیٰ دوری کے ہیں۔ چونکہ یہ مردود بھی انسانی طبیعت سے دور ہے، بلکہ ہر بھلائی سے بعید ہے اس لیے اسے شیطان کہتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شاط سے مشتق ہے اس لئے کہ وہ آگ سے پیدا شدہ ہے۔ اور شاط کے معنی یہی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ معنی کی رو سے تو دونوں ٹھیک

ہیں، لیکن اوّل زیادہ صحیح ہے عرب شاعروں کے شعر بھی اس کی تصدیق میں ملتے ہیں۔ اُمیہ بن ابوصلت اور نابغہ کے شعروں میں بھی یہ لفظ شطن سے مشتق ہے اور دُور ہونے کے معنی میں مستعمل ہے۔ سیبویہ کا قول ہے کہ جب کوئی شیطانی کام کرے تو عرب کہتے ہیں تشیطن فلانٌ یہ نہیں کہتے کہ تَشَیَّطَ فلانٌ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لفظ شاط سے نہیں، بلکہ شطن سے ماخوذ ہے اور اس کے صحیح معنی بھی دُوری کے ہیں جو جن و انس و حیوان سرکشی کرے اُسے شیطان کہہ دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ الخ یعنی اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن شیاطین جن و انس کئے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکے کی بناوٹی باتیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ مسند احمد میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے کہ حضورؐ نے انہیں فرمایا اے ابوذر جنات اور انسانی کے شیطانوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو۔ میں نے کہا کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں صحیح مسلم شریف میں انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز کو عورت، گدھا اور کالا کتا توڑ دیتا ہے۔ میں نے کہا حضورؐ سرخ زرد کتوں میں سے کالے کتے کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا کالا کتا شیطان ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ ترکی گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں وہ ناز و خرام سے چلتا ہے۔ حضرت عمرؓ اُسے مارتے پیٹتے بھی ہیں، لیکن اس کا اکڑنا اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ آپ اُتر پڑتے ہیں اور فرماتے ہیں تم تو میری سواری کے لیے کسی شیطان کو پکڑ لائے۔ میرے نفس میں تکبر آنے لگا۔ چنانچہ میں نے اس سے اُتر پڑنا ہی مناسب سمجھا۔ رجیم فعیل کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے یعنی وہ مرجوم ہے۔ یعنی ہر بھلائی سے دُور ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ الخ ہم نے دنیا کے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا اور انہیں شیطانوں کے لیئے رجم بنایا۔ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا الخ یعنی ہم نے دنیا کو تاروں سے زینت دی اور ہر سرکش شیطان سے بچاؤ بنایا۔ وہ اعلیٰ فرشتوں کی باتیں نہیں سن سکتے اور ہر طرف سے مارے جاتے ہیں بھگانے کے لیے اور لازمی عذاب ان کیلئے ہے جو ان میں سے کوئی بات اُچک کر بھاگتا ہے اس کے پیچھے ایک چمکیلا شعلہ لگتا ہے۔ اور جگہ ارشاد وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا الخ یعنی ہم نے آسمان میں برج بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لیے زینت بنایا اور اسے ہر راندھے ہوئے شیطان سے ہم نے محفوظ کر لیا، مگر جو کسی بات کو چُرا لے جائے اس کے پیچھے چمکتا ہوا شعلہ لگتا ہے۔ اسی طرح کی اور آیتیں بھی ہیں رجیم کے ایک معنی راجم کے بھی کئے گئے ہیں۔ چونکہ شیطان لوگوں کو وسوسوں اور گمراہیوں سے رجم کرتا ہے اس لیئے اُسے رجیم یعنی راجم کہتے ہیں۔ اب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر سُنئے۔

# بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

صحابہؓ نے کتاب اللہ کو اسی کیساتھ شروع کیا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ سورۂ نمل کی ایک آیت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ ہر سورت کے شروع میں ایک مستقل آیت ہے؟ یا ہر سورت کی ایک مستقل آیت ہے جو اس کے شروع میں لکھی گئی ہے؟ یا ہر سورت کی بعض آیت ہے؟ یا اس طرح سورۂ فاتحہ ہی کی آیت ہے اور دوسری سورتوں کی نہیں؟ یا صرف ایک سورت کو دوسری سورت سے علیحدہ کرنے کے لیئے لکھی گئی ہے؟ اور آیت نہیں ہے؟ علماء سلف و خلف کا ان امور میں اختلاف چلا آتا ہے اور اپنی جگہ پر اس کی تفصیل موجود ہے۔ سنن ابوداؤد میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سورت کو دوسری سورت سے علیحدہ نہیں فرما سکتے تھے جب تک کہ آپ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل نہیں ہوتی تھی۔ مستدرک حاکم میں بھی یہ حدیث ہے ایک مرسل حدیث میں حضرت سعید بن جبیر سے بھی یہ روایت مروی ہے۔ صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الخ کو سورۂ فاتحہ کے شروع میں نماز میں پڑھا اور اسے ایک آیت شمار کی، لیکن اس کے ایک روای عمر بن ہارون بلخی ضعیف ہیں اور اس کی متابعت میں ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، اور اسی کی مثل حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت علی رضی اللہ عنہم اور حضرت عطاؒ، حضرت طاؤس، حضرت سعید ابن جبیرؒ حضرت مکحولؒ حضرت زہری رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے کہ بسم اللہ الخ ہر سورت کی ایک مستقل آیت ہے سوائے سورۂ برات کے علاوہ ان صحابہؓ اور تابعینؒ کے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ امام شافعیؒ امام احمد کے ایک قول میں اور اسحٰق بن راہویہ اور ابوعبید قاسم ابن سلام رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ البتہ امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ بسم اللہ الخ نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے نہ کسی اور سورت کی۔ امام شافعیؒ کا ایک قول تو یہ مروی ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کی تو ایک آیت ہے لیکن اور سورتوں کی نہیں۔ ایک قول ان کا یہ بھی ہے کہ یہ ہر سورت کی بعض اول کی آیت ہے، لیکن یہ دونوں قول غریب ہیں۔ داؤدؒ کہتے ہیں کہ یہ ہر سورت کے اول میں ایک مستقل آیت ہے۔ سورت میں داخل نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ سے بھی یہی روایت ہے اور ابوبکر رازی نے ابوالحسن کرخی کا بھی یہی مذہب بیان کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے یہ بڑے پایہ کے ساتھی ہیں۔ یہ تو تھی بحث بسم اللہ الخ کے سورۂ فاتحہ کی آیت ہونے نہ ہونے کی۔ اب اس میں بھی اختلاف ہے کہ آیا اسے باآواز بلند پڑھنا چاہیئے یا پست آواز سے؟ جو لوگ اسے سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں کہتے وہ تو اسے بلند آواز سے پڑھنے کے بھی قائل نہیں۔ اسی طرح جو لوگ اسے سورۂ فاتحہ سے الگ ایک آیت مانتے ہیں وہ اس کے پست آواز سے پڑھنے کے قائل ہیں۔ رہے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ یہ ہر سورت کے اول سے ہے انمیں اختلاف ہے۔ شافعی رحمہ اللہ کا تو مذہب ہے کہ سورۂ فاتحہ اور ہر سورت کے پہلے اسے اونچی آواز سے پڑھنا چاہیئے۔ صحابہؓ کی تابعینؒ کی مسلمانوں کے اگلے اور پچھلے اماموں کی جماعتوں کا یہی مذہب ہے۔ صحابہؓ میں سے اسے اونچی آواز سے پڑھنے والے حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت معاویہ، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ہیں۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان سے بھی غریب سند سے امام خطیبؒ نے نقل کیا ہے اور بیہقی اور ابن عبدالبرؒ نے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے بھی روایت کی ہے۔ تابعینؒ میں سے حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت عکرمہؒ، حضرت ابوقلابہؒ، حضرت زہری، حضرت علی بن حسن، ان کے لڑکے محمد سعید بن مسیب، عطا، طاؤس، مجاہد سالم، محمد بن کعب قرظی، عبید ابوبکر بن بکر بن محمد بن عمرو، ابن حزم ابوداؤد ابن سیرین محمد بن منکدر، علی بن عبداللہ بن عباس ان کے صاحبزادے محمد نافع ابن عمر کے مولیٰ زید بن اسلم، عمر بن عبدالعزیز ارزق بن قیس حبیب، بن

ابی ثابت، ابوشعشاء، مکحول۔ عبداللہ بن مغفل بن مقرنؓ اور بروایت بیہقی، عبداللہ بن صفوان، محمد ابن حنفیہ اور بروایت ابن عبدالبر، عمرو بن دینار یہ سب ان نمازوں میں جن میں قرأت اُونچی آواز سے پڑھی جاتی ہے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ بھی بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ ایک دلیل تو اس کی یہ ہے کہ جب یہ آیت سورۂ فاتحہ میں سے ہے تو پھر پوری سورت کی طرح یہ بھی اُونچی آواز سے ہی پڑھنی چاہیے۔ علاوہ ازیں سنن نسائی صحیح ابن خزیمہ صحیح ابن حبان مستدرک حاکم میں مروی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز پڑھی اور قرأت میں اُونچی آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اور فارغ ہونے کے بعد فرمایا میں تم سب سے زیادہ مشابہ ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں۔ اس حدیث کو دارقطنی خطیب اور بیہقی وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا کرتے تھے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث ایسی زیادہ صحیح نہیں۔ مستدرک حاکم میں انہی سے روایت ہے کہ حضورؐ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔ امام حاکمؒ نے اسے صحیح کہا ہے صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کس طرح تھی؟ فرمایا کہ ہر کھڑے لفظ کو آپؐ دراز کر کے پڑھتے تھے۔ پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو پڑھ کر سنائی۔ بِسۡمِ اللّٰہِ پر مد کیا الرَّحۡمٰنِ پر مد کیا الرَّحِیۡمِ پر مد کیا۔ مسند احمد سنن ابوداؤد صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہر آیت پر رکتے تھے۔ اور آپؐ کی قرأت الگ الگ ہوتی تھی۔ جیسے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ پھر ٹھہر کر۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ پھر ٹھہر کر اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ پھر ٹھہر کر مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ دارقطنی اسے صحیح بتاتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام حاکمؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ میں نماز پڑھائی اور بسم اللہ نہ پڑھی تو جو مہاجر اصحابؓ اس وقت موجود تھے انہوں نے ٹوکا۔ چنانچہ پھر جب نماز پڑھانے کو کھڑے ہوئے تو بسم اللہ الخ پڑھی۔ غالباً اس قدر احادیث و آثار اس مذہب کی حجت کے لیے کافی ہیں۔ باقی رہے اور اس کے خلاف آثار اور روایات اور ان کی سندیں اور ان کی تعلیل ان کا ضعف اور اُن کی تقریر وغیرہ ان کے لیے اور جگہ ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ نماز میں بسم اللہ کو زور سے نہ پڑھنا چاہیے۔ خلفاء اربعہ سے عبداللہ بن مغفل سے اور تابعین اور بعد والوں کی جماعتوں سے یہ ثابت ہے ابوحنیفہ، ثوری، احمد بن حنبل کا یہی مذہب ہے۔

امام مالکؒ کا مذہب ہے کہ سرے سے بسم اللہ پڑھے ہی نہیں۔ نہ تو آہستہ نہ بلند۔ ان کی دلیل ایک تو صحیح مسلم والی حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کو تکبیر سے اور قرأت کو اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ سے شروع کیا کرتے تھے صحیحین میں ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ سے یہ سب شروع کرتے تھے مسلم میں ہے کہ بسم اللہ الخ کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ نہ تو قرأت کے شروع میں اور نہ قرأت کے آخر میں۔ سنن میں حضرت معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ یہ ہے دلیل ان ائمہ کی بسم اللہ آہستہ پڑھنے کی۔ یہ خیال رہے کہ یہ کوئی بڑا اختلاف نہیں ہر ایک فریق دوسرے کی نماز کی صحت کا قائل ہے فالحمد للہ (بسم اللہ کا مطلق نہ پڑھنا تو ٹھیک نہیں۔ بلند و پست پڑھنے کی احادیث میں اس طرح تطبیق ہو سکتی ہے کہ دونوں بار ہیں۔ گو پست پڑھنے کی احادیث قدرے زور دار ہیں۔ واللہ اعلم۔ مترجم)

## فصل ۔ بسم اللہ کی فضیلت کا بیان

تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بسم اللہ کی نسبت سوال کیا۔ آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بڑے نام میں اور اس میں اس قدر نزدیکی ہے جیسے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی میں۔ ابن مردُویہ میں بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ اور یہ روایت بھی ابن مردُویہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب عیسیٰ علیہ السلام کو اُن کی والدہ نے معلم کے پاس بٹھایا اس نے کہا لکھئے۔ بسم اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا بسم اللہ کیا ہے؟ استاد نے جواب دیا میں نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا "ب" سے مراد اللہ کا بہاء یعنی بلندی ہے اور "س" سے مراد اس کی سناء یعنی نور روشنی ہے اور "م" سے مراد اس کی "مملکت" یعنی بادشاہی ہے اور "اللہ" کہتے ہیں معبودوں کے معبود کو اور "رحمٰن" کہتے ہیں دنیا اور آخرت میں رحم کرنیوالے کو اور "رحیم" کہتے ہیں آخرت میں کرم و رحم کرنیوالے کو۔ ابن جریر میں بھی یہ روایت ہے۔ لیکن سند کی رو سے بعید غریب ہے ممکن ہے کسی صحابی وغیرہ سے مروی ہو اور ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کی روایتوں میں سے ہو۔ مرفوع حدیث نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ ابن مردُویہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر ایک ایسی آیت اُتری ہے کہ کسی نبی پر سوائے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایسی آیت نہیں اتری۔ وہ آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ جب یہ آیت اتری۔ بادل مشرق کی طرف چھٹ گئے۔ ہوائیں ساکن ہو گئیں۔ سمندر ٹھہر گیا۔ جانوروں نے کان لگا لیئے۔ شیاطین پر آسمان سے شعلے گرے اور پروردگار عالم نے اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس چیز پر میرا یہ نام لیا جائیگا اس میں ضرور برکت ہو گی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جہنم کے انیس ۱۹ داروغوں سے جو بچنا چاہے وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے۔ اس کے بھی انیس ۱۹ حروف ہیں۔ ہر حرف ہر فرشتے سے بچاؤ بن جائے گا۔ اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے اور اس کی تائید ایک حدیث سے بھی کی ہے۔ جس میں ہے کہ میں نے تیس ۳۰ سے اُوپر فرشتوں کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے۔ یہ حضورؐ نے اس وقت فرمایا تھا جب ایک شخص نے رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيهِ پڑھا تھا اس میں بھی تیس ۳۰ سے زیادہ حروف ہیں۔ اُتنے ہی فرشتے اُترے۔ اس طرح بسم اللہ میں بھی انیس حروف ہیں اور وہاں فرشتوں کی تعداد بھی انیس ۱۹ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مسند احمد میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری پر آپ کے پیچھے جو صحابی سوار تھے ان کا بیان ہے کہ حضورؐ کی اونٹنی ذرا پھسلی تو میں نے کہا شیطان کا ستیاناس ہو آپ نے فرمایا نہ کہو اس سے شیطان پھولتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ گویا اس نے اپنی قوت سے گرایا۔ ہاں بسم اللہ کہنے سے وہ مکھی کی طرح ذلیل و پست ہو جاتا ہے۔ نسائی نے اپنی کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں اور ابن مردُویہ نے اپنی تفسیر میں بھی اسے بیان کیا ہے اور ان کا نام اسامہ بن عمیر بتلایا ہے اور اس میں ہے کہ بسم اللہ کہو۔ یہ بسم اللہ کی برکت ہے۔ اسی لیئے ہر کام اور ہر بات کے شروع میں بسم اللہ کہہ لینا مستحب ہے۔ خطبہ کے شروع میں بھی بسم اللہ کہنی چاہیئے۔ حدیث میں ہے کہ جس کام کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکتا ہوتا ہے۔ پاخانے جانے کے وقت بھی بسم اللہ پڑھ لے۔ حدیث میں یہ بھی ہے کہ وضو کے وقت بھی پڑھ لے۔ مسند احمد اور سنن میں ابوہریرہ، سعید بن زید اور ابو سعید رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص وضو میں اللہ کا نام نہ لے اس کا وضو نہیں ہوتا۔ یہ حدیث حسن ہے بعض علماء تو وضو کے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب بتلاتے ہیں۔ بعض مطلق وجوب کے قائل ہیں۔ جانور کو ذبح کے وقت بھی اس کا پڑھنا مستحب ہے امام شافعیؒ اور ایک اور جماعت کا یہی خیال ہے۔ بعضوں نے ذکر کے وقت اور بعضوں نے مطلقاً اسے واجب کہا ہے۔ اس کا بیان عنقریب آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ امام رازیؒ نے اپنی کتاب میں اس آیت کی فضیلت میں بہت سی احادیث بیان کی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ جب تو اپنی بیوی کے پاس جائے اور بسم اللہ پڑھ لے اور اسی سے خدا کوئی اولاد بخشے تو اس کے اور اس کی اولاد کے سانس کی گنتی کے برابر تیرے نامۂ اعمال میں نیکیاں لکھی جائیں گی۔ لیکن یہ روایت بالکل لا اصل ہے۔ میں نے تو اسے کہیں نہیں پایا۔ کھاتے وقت بھی بسم اللہ پڑھنی مستحب ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن ابو سلمہؓ سے فرمایا جو آپ کے گھر میں

حضرت ام سلمہؓ کے پہلے خاوند سے تھے کہ بسم اللہ کہو اور اپنے داہنے ہاتھ سے کھایا کرو اور اپنے سامنے سے نوالہ اُٹھایا کرو۔ بعض علماء اس وقت بھی بسم اللہ کا کہنا واجب بتلاتے ہیں۔ بیوی سے ملنے کے وقت بھی بسم اللہ پڑھنی چاہیئے۔ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ملنے کا ارادہ کرے تو یہ پڑھے بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا یعنی اے خدا ہمیں اور جو ہمیں تو دے اُسے شیطان سے بچا۔ فرماتے ہیں کہ اگر اس جماع حمل ٹھیر گیا تو اس بچہ کو شیطان کبھی نقصان نہ پہونچا سکے گا۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بسم اللہ کی "ب" کا تعلق کس سے ہے۔

نحویوں کے اس میں دو۲ قول ہیں اور دونوں قریب قریب ہیں، بعض اسم بتلاتے ہیں اور بعض فعل۔ ہر ایک کی دلیل قرآن میں ملتی ہے۔ جو لوگ اسم کے ساتھ متعلق بتلاتے ہیں وہ تو کہتے ہیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ ابْتِدَائِیْ یعنی اللہ کے نام سے میری ابتداء ہے۔ قرآن میں ہے۔ اِرْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا الخ اس میں اسم یعنی مصدر ظاہر کر دیا گیا ہے، اور جو لوگ فعل کے ساتھ مقدر بتلاتے ہیں چاہے وہ امر ہو یا خبر جیسے اَبْدَأُ بِسْمِ اللّٰهِ اور اِبْتَدَأْتُ بِاسْمِ اللّٰهِ ان کی دلیل آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ الخ ہے۔ در اصل دونوں ہی صحیح ہیں اس لیئے کہ فعل کے لیئے بھی مصدر کا ہونا ضروری ہے تو اختیار ہے کہ فعل کو مقدر مانا جائے اور اس کے مصدر کو مطابق اس فعل کے جس کا نام پہلے لیا گیا ہے کھڑا ہونا ہو، بیٹھنا ہو، کھانا پینا ہو، قرآن کا پڑھنا ہو یا وضو اور نماز وغیرہ ہو۔ ان سب کے شروع میں برکت حاصل کرنے کے لیئے امداد چاہنے کے لیے اور قبولیت کیلئے اللہ تعالیٰ کا نام لینا شروع ہے واللہ اعلم۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم میں روایت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جبرئیل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی لیکر آئے تو فرمایا، اے محمد کہیئے اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پھر کہئے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مقصود یہ تھا کہ اُٹھنا بیٹھنا، پڑھنا سب اللہ کے نام سے شروع ہو۔

اسم یعنی نام ہی مسمّیٰ یعنی نام والا ہے یا کچھ اور اس میں اہل علم کے تین قول ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسم ہی مسمّیٰ ہے۔ ابو عبیدہ کا اور سیبویہ کا یہی قول ہے۔ باقلانی اور ابن فورک بھی اسی کو پسند کرتے ہیں۔ ابن خطیب رازی اپنی تفسیر کے مقدمات میں لکھتے ہیں۔ حشویہ اور کرامیہ اور اشعریہ تو کہتے ہیں کہ اسم نفس مسمّیٰ ہے اور نفس تسمیہ کا غیر ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ اسم مسمّیٰ کا غیر ہے اور نفس تسمیہ ہے۔ ہمارے نزدیک اسم مسمّیٰ کا بھی غیر ہے اور تسمیہ کا بھی۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر اسم سے مراد لفظ ہے جو آوازوں کی ٹکڑوں اور حروف کا مجموعہ ہے تو بالبداہت ثابت ہے کہ یہ مسمّیٰ کا غیر ہے اور اگر اسم سے مراد ذات مسمّیٰ ہے تو یہ وضاحت کو واضح کرتا ہے جو محض بیکار ہے اسلئے ظاہر ہے کہ اس بیکار بحث میں پڑنا ہی فضول ہے۔ اس کے بعد اسم اور مسمّیٰ کے فرق پر دلائل لائے ہیں کہ کبھی اسم ہوتا ہے اور مسمّیٰ ہوتا ہی نہیں، جیسے معدوم کا لفظ کبھی ایک مسمّیٰ کے کئی اسم ہوتے ہیں جیسے مترادف کبھی اسم ایک ہوتا ہے اور مسمّیٰ کئی ایک ہوتے ہیں جیسے مشترک۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسم اور چیز ہے اور مسمّیٰ اور چیز ہے۔ یعنی نام الگ ہے اور نام والا الگ ہے اور دلیل سُنئے کہ اسم تو لفظ ہے اور وہ عرض ہے اور مسمّیٰ کبھی تو ذات ہوتی ہے ممکن یا واجب اور سنئے اگر اسم ہی کو مسمّیٰ مانا جائے تو چاہیئے کہ آگ کا نام لیتے ہی حرارت معلوم ہو اور برف کا نام لیتے ہی ٹھنڈک پہنچے، حالانکہ کوئی عاقل ایسا نہیں کہہ سکتا۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ کے بہت سے بہترین نام ہیں تم اُن ناموں سے اسے پکارو۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں تو خیال کیجئے کہ نام کس قدر بکثرت ہیں۔ حالانکہ مسمّیٰ ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ اسی طرح اسماء کو اللہ کی طرف اس آیت میں مضاف کرنا اور جگہ فرمانا فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ وغیرہ یہ اضافت بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ اسم اور ہو اور مسمّیٰ اور کیونکہ اضافت کا مقتضا مغائرت ہے۔ اسی طرح یہ حکم فرمانا ہے کہ فَادْعُوْهُ بِهَا یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے ناموں کے ساتھ پکارو۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ نام اور ہے اور نام والا اور۔ اب ان کے دلائل سنئے جو اسم اور مسمّیٰ کو ایک ہی بتلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ الخ یعنی جلال واکرام والے تیرے رب کا بابرکت نام ہے۔ تو نام کو برکتوں والا فرمایا۔ حالانکہ خود اللہ تعالیٰ

برکتوں والا ہے۔ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ اس مقدس ذات کی وجہ سے اس کا نام بھی بڑائیوں والا ہے۔ دوسری دلیل ان کی یہ ہے کہ جب کوئی شخص کہے کہ زینب پر طلاق ہے تو طلاق اس کی بیوی پر جس کا نام زینب ہے پڑ جاتی ہے۔ اگر نام اور نام والے میں فرق ہوتا تو نام پر طلاق پڑتی نام والے پر کیسے پڑ جاتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ اُس ذات پر طلاق ہے جس کا نام زینب ہے۔ تسمیہ کا اسم سے الگ ہونا اس دلیل کی بناء پر ہے کہ تسمیہ کہتے ہیں کسی کا نام مقرر کرنے کو اور ظاہر ہے کہ یہ اور چیز ہے اور نام والا اور چیز ہے۔ رازیؒ کا قول یہی ہے۔ یہ سب کچھ تو لفظ ”باسم“ کے متعلق تھا۔ اب لفظ ”اللہ“ کے متعلق سنیئے۔

”اللہ“ خاص نام ہے رب تبارک وتعالیٰ کا۔ کہا جاتا ہے کہ اسم اعظم یہی ہے۔ اس لیئے کہ تمام عمدہ صفتوں کے ساتھ یہی موصوف ہوتا ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ الخ یعنی وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو چھپے کھلے کا جاننے والا ہے، جو رحم کرنے والا مہربان ہے۔ وہ اللہ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، جو بادشاہ ہے۔ پاک ہے سلامتی والا ہے، امن دینے والا ہے، محافظ ہے، غلبہ والا ہے، زبردست ہے، بڑائی والا ہے، وہ ہر شرک سے اور شرک کی چیز سے پاک ہے، وہ اللہ پیدا کرنیوالا، بنانے والا، صورت بخشنے والا۔ اس کے لیے بہترین پاکیزہ نام ہیں۔ آسمان و زمین کی تمام چیزیں اس کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔ وہ عزتوں اور حکمتوں والا ہے، ان آیتوں میں باقی کل نام صفت ہیں اور لفظ اللہ کی صفت ہیں پس اصلی نام اللہ ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا کہ اللہ ہی کے لیئے ہیں پاکیزہ اور عمدہ نام۔ پس تم اس کو ان ناموں سے پکارو۔ اور فرماتا ہے۔ اللہ کو پکارو۔ یا رحمٰن کو پکارو جس نام سے پکارو اسی کے پیارے پیارے اور اچھے اچھے نام ہیں۔ بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ننانوے 99 نام ہیں۔ ایک کم ایک سو۔ جو انہیں یاد کرلے جنتی ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں ان ناموں کی تفصیل بھی آئی ہے اور دونوں کی روایتوں میں الفاظ کا کچھ فرق کچھ کمی زیادتی بھی ہے رازیؒ نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پانچ ہزار نام ہیں، ایک ہزار تو قرآن شریف اور صحیح حدیث میں ہیں اور ایک ہزار توراۃ میں اور ایک ہزار انجیل میں اور ایک ہزار زبور میں اور ایک ہزار لوح محفوظ میں۔ اللہ وہ نام ہے جو سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی اور کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عرب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا اشتقاق کیا ہے اس کا باب کیا ہے۔ بلکہ نحویوں کی ایک بڑی جماعت کا خیال ہے کہ یہ اسم جامد ہے اور اس کا کوئی اشتقاق ہے ہی نہیں۔ قرطبی نے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت کا یہ مذہب نقل کیا ہے جن میں سے حضرت امام شافعی، امام خطابی، امام الحرمین، امام غزالی وغیرہ ہیں۔ خلیل اور سیبویہ سے روایت ہے کہ الف لام اس میں لازم ہے۔ امام خطابی نے اس کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ یا اللہ تو کہہ سکتے ہیں۔ مگر یا الرحمٰن کہتے کسی کو نہیں سُنا۔ اگر لفظ اللہ میں الف لام اصل کلمہ کا نہ ہوتا تو اس پر ندا کا لفظ یا داخل نہ ہو سکتا۔ کیونکہ قواعد عربی کے لحاظ سے حرف ندا کا الف لام والے اسم پر داخل ہونا جائز نہیں۔ بعض لوگوں کا یہ قول بھی ہے کہ یہ مشتق ہے۔ اور اس پر روبہ کا ایک شعر بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ جس میں مصدر تَاَلُّہ کا بیان ہے جس کا ماضی مضارع اِلٰہَ یَاْلَہُ اِلٰھَۃً اور تَاَلُّھًا ہے۔ جیسے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ وَيَذَرَكَ وَاِلٰهَتَكَ پڑھتے تھے مراد اس سے عبادت ہے۔ یعنی اس کی عبادت کی جاتی ہے اور وہ کسی کی عبادت نہیں کرتا مجاہدؒ وغیرہ کہتے ہیں بعضوں نے اس پر اس آیت سے دلیل دی ہے کہ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ اور آیت میں ہے وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ یعنی وہی اللہ ہے آسمانوں میں اور زمین میں وہی ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے۔ سیبویہ خلیل سے نقل کرتے ہیں کہ اصل میں یہ اِلٰہٌ تھا جیسے فِعَالٌ پھر ہمزہ کے بدلے الف و لام لایا گیا۔ جیسے النَّاس کہ اس کی اصل اُنَاسٌ ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ لفظ اللہ کی اصل لَاہٌ ہے الف لام حرف تعظیم کے طور پر لایا گیا ہے۔ سیبویہ کا بھی پسندیدہ قول یہی ہے۔ عرب شعراء کے اشعار میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ کسائی اور فراء کہتے ہیں اس کی اصل اَلْاِلٰہُ تھی۔ ہمزہ کو حذف کیا اور پہلے لام کو دوسرے میں ادغام کیا۔ جیسا کہ لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ میں لٰكِنْ اَنَا کا لٰكِنَّا ہوا ہے

چنانچہ حسن کی قرأت میں لٰکِنَّ اَنَا ہی ہے اور اس کا اشتقاق وَلَہَ سے ہے اور اس کے معنی تَحَیُّر ہیں وَلَہٌ عقل کے چلے جانے کو کہتے ہیں۔ عربی میں رَجُلٌ وَالِہٌ اور اِمْرَأَۃٌ وَلْہیٰ اور مَوْلُوہَۃٌ اُس وقت کہتے ہیں جب وہ جنگل میں بھیجدیا جائے۔ چوں کہ ذات باری تعالیٰ میں اور اس کی صفتوں کی تحقیق میں عقل حیران و پریشان ہو جاتی ہے۔ اس لیئے ذات پاک کو اللہ کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر اصل میں یہ لفظ وِلَاہٌ تھا واو کو ہمزہ سے بدل دیا گیا۔ جیسے کہ وِشَاحٌ اور وِسَادَۃٌ میں اشاح اور اسادہ کہتے ہیں۔ رازی کا قول ہے کہ یہ لفظ اَلِھْتُ اِلیٰ فُلَانٍ سے مشتق ہے جو کہ معنی میں سَکَنْتُ کے ہیں۔ یعنی میں نے فلاں سے سکونت اور راحت حاصل کی۔ چونکہ عقل کا سکون صرف ذات باری تعالیٰ کے ذکر کی طرف ہے اور روح کی حقیقی خوشی اس کی معرفت میں ہے اس لیئے کہ علی الاطلاق وہی ہے کامل اس کے سوا کوئی اور نہیں اسی وجہ سے اللہ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ یعنی ایمانداروں کے دل صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ لَاہَ یَلُوْہُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی چھپ جانے اور حجاب کرنے کے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اَلِہَ الْفَصِیْلُ سے ہے، چونکہ بندے اسی کی طرف تضرع اور زاری سے جھکتے ہیں۔ اسی کے دامن رحمت کو ہر حال میں تھامتے ہیں اسی لیے اُسے اللہ کہا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ عرب اَلِہَ الرَّجُلُ یَاْلَہُ اس وقت کہتے ہیں جب کسی اچانک امر سے کوئی گھبرا اُٹھے اور دوسرا اسے پناہ دے اور بچالے۔ چونکہ تمام مخلوق کو ہر مصیبت سے نجات دینے والا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہے۔ اس لیئے اسے اللہ کہتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ وَھُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ یعنی وہی بچاتا ہے اور اس پر کوئی نہیں بچایا جاتا حقیقی مُنْعِم وہی ہے۔ فرماتا ہے تم پر جتنی نعمتیں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں۔ وہی مُطْعِم ہے فرماتا ہے وہ کھلاتا ہے اور اُسے کوئی نہیں کھلاتا۔ وہی مُوجِد ہے۔ فرماتا ہے ہر چیز کا وجود اللہ کی طرف سے ہے رازی کا مختار مذہب یہی ہے کہ لفظ اللہ مشتق نہیں ہے۔ خلیل، سیبویہ، اکثر اصولی اور فقہاء کا یہی قول ہے۔ اس کی بہت سی دلیلیں بھی ہیں اگر یہ مشتق ہوتا تو اس کے معنی میں بہت سے افراد کی شرکت ہوتی، حالانکہ ایسا نہیں۔ پھر اس لفظ کو موصوف بنایا جاتا ہے، اور بہت سی اس کی صفتیں آتی ہیں۔ جیسے رحمٰن، رحیم، مالک، قدوس وغیرہ۔ تو معلوم ہوا کہ یہ مشتق نہیں۔ قرآن میں ایک جگہ عَزِیْزِ الْحَمِیْدِ اللّٰہِ الخ جو آتا ہے وہاں یہ عطف بیان ہے۔ ایک دلیل اس کے مشتق نہ ہونے کی ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا یعنی کیا اس کا ہم نام بھی کوئی جانتے ہو؟ بیان کی جاتی ہے۔ لیکن یہ غور طلب ہے واللہ اعلم۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے، لیکن رازی نے اس قول کو ضعیف کہا ہے اور فی الواقع وہ ہے بھی ضعیف۔ رازی فرماتے ہیں کہ مخلوق کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جو معرفت خداوندی کے آخری درجہ پر پہنچ گئے، دوسرے وہ جو اس سے محروم ہیں جو حیرت کی اندھیریوں میں اور جہالت کی پُرخار وادیوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ تو عقل کو رو بیٹھے ہیں اور روحانی کمالات کو کھو بیٹھے ہیں، لیکن جو ساحل معرفت پر پہونچ چکے ہیں جو نورانیت کے وسیع باغوں میں جا ٹھیرے ہیں جو کبریائی اور جلال کی وسعت کا اندازہ کر چکے ہیں وہ بھی یہاں تک پہنچکر بھونچکے رہ گئے ہیں اور بارگاہ یزدانیت اور دربار صمدیت میں مبہوت کھڑے رہ گئے ہیں۔ غرض ساری مخلوق اس کی پوری معرفت سے عاجز اور سرگشتہ و حیران ہے، پس اس معنی کر اُس پاک ذات کا نام اللہ ہے ساری مخلوق اُس کی محتاج، اس کے سامنے جھکنے والی اور اس کی تلاش کرنیوالی ہے۔ اس معنی کر اُسے اللہ کہتے ہیں جیسا کہ خلیل کا قول ہے۔ عرب محاورے میں ہر اُونچی اور بلند چیز کو لا کہتے ہیں۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تب بھی وہ کہتے ہیں۔ لَاھَتِ الشَّمْسُ چونکہ پروردگار عالم بھی سب سے بلند و بالا ہے اس کو بھی اللہ کہتے ہیں اور اِلٰہَ کے معنی عبادت کرنے کے اور تَاَلُّہٌ کے معنے حکمبرداری اور قربانی کرنے کے ہیں اور خداوند عالم کی عبادت کی جاتی ہے اور اس کے نام پر قربانیاں کی جاتی ہیں اس لیئے اسے اللہ کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ کی قرأت میں ہے۔ وَیَذَرَکَ وَاِلٰھَتَکَ اس کی اصل الالٰہ ہے پس ”ف“ کلمہ کی جگہ پر جو ہمزہ تھا وہ حذف کی گئی۔ پھر نفس کلمہ کا لام زائد لام سے جو تعریف کے لیئے لایا گیا ہے اس سے مل گیا اور ایک کو دوسرے میں ادغام کیا گیا تو ایک لام مشدد رہ گیا اور تعظیماً اللہ کہا گیا۔ یہ تو تفسیر اللہ کی تھی۔ اب آگے اور بیان ہوتی ہے۔

## اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ یہ دونوں نام رحمت سے مشتق ہیں دونوں میں مبالغہ ہے۔ رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے۔ علامہ ابن جریر کے قول سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس پر اتفاق ہے بعض سلف کی تفسیروں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول بھی اسی معنی کا پہلے گذر چکا ہے کہ رحمٰن سے مراد دنیا اور آخرت میں رحم کرنے والا اور رحیم سے مراد آخرت میں رحم کرنے والا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن مشتق نہیں ہے۔ اگر یہ اس طرح ہوتا تو مرحوم کے ساتھ ملتا۔ حالانکہ قرآن میں بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا آیا ہے۔ مبرد کہتے ہیں کہ رحمٰن عبرانی نام ہے عربی نہیں۔ ابو اسحاق زجاج معانی القرآن میں لکھتے ہیں کہ احمد بن یحییٰ کا قول ہے کہ رحیم عربی لفظ ہے۔ اور رحمٰن عبرانی ہے۔ دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے لیکن ابو اسحٰق فرماتے ہیں اس قول کو دل قبول نہیں کرتا۔ قرطبی فرماتے ہیں اس لفظ کے مشتق ہونے کی یہ دلیل ہے کہ ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں رحمٰن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا اور اپنے ناموں سے اس کا نام مشتق کیا۔ اسکے ملانے والے کو میں ملاؤں گا اور اس کے توڑنے والے کو میں کاٹ دوں گا۔ اب صریح حدیث کی مخالفت اور انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ رہا کفار عرب کا اس نام سے انکار کرنا یہ محض ان کی جہالت کا ایک کرشمہ تھا۔ قرطبی کہتے ہیں کہ رحمٰن اور رحیم کے ایک ہی معنی ہیں جیسے نَدْمَانٌ اور نَدِیْمٌ ابو عبیدہ کا یہی قول ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ فَعْلَانٌ۔ فَعِیْلٌ کی طرح نہیں۔ فعلان میں مبالغہ ضروری ہوتا ہے۔ جیسے غَضْبَانٌ اسی شخص کو کہہ سکتے ہیں جو بہت ہی غصہ والا ہو۔ اور فعیل صرف فاعل اور صرف مفعول کے لیئے بھی آتا ہے جو مبالغہ سے خالی ہوتا ہے۔ ابو علی فارسی کہتے ہیں کہ رحمٰن عام اسم ہے جو ہر قسم کی رحمتوں کو شامل ہے اور صرف خداوند تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور رحیم باعتبار مومنوں کے ہے۔ فرماتا ہے وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا مومنوں کے ساتھ رحیم ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ دونوں نام رحمت و رحم والے ہیں۔ ایک میں دوسرے سے زیادہ رحمت و رحم ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت میں لفظ اَرَقُّ ہے۔ اس کے معنی خطابی وغیرہ اَرْفَقُ کرتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ رفیق یعنی نرمی اور مہربانی والا ہے وہ ہر کام میں نرمی اور آسانی کو پسند کرتا ہے وہ نرمی اور آسانی پر وہ نعمتیں و رحمت فرماتا ہے جو سختی پر عطا نہیں فرماتا۔ ابن المبارکؒ فرماتے ہیں رحمٰن اُسے کہتے ہیں کہ جب اُس سے جو مانگا جائے عطا فرمائے اور رحیم وہ ہے کہ جب اُس سے نہ مانگا جائے وہ غضب ناک ہو۔ ترمذی کی حدیث میں ہے جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوتا ہے۔ بعض شاعروں کا قول ہے ؎

اَللّٰہُ یَغْضَبُ اِنْ تَرَکْتَ سُؤَالَہٗ    وَبُنَیُّ اٰدَمَ حِیْنَ یُسْاَلُ یَغْضَبُ

یعنی اللہ تعالیٰ سے نہ مانگو تو وہ ناراض ہوتا ہے اور بنی آدم سے مانگو تو وہ بگڑتے ہیں۔ عرزمی فرماتے ہیں کہ رحمٰن کے معنی تمام مخلوق پر رحم کرنیوالا اور رحیم کے معنی مومنوں پر رحم کرنیوالا ہے۔ دیکھیے قرآن کریم کی دو آیتوں ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی میں استویٰ کے ساتھ رحمٰن کا لفظ ذکر کیا تاکہ تمام مخلوق کو یہ لفظ اپنے عام رحم و کرم کے معنی سے شامل ہو سکے اور مومنوں کے ذکر کے ساتھ لفظ رحیم فرمایا وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۝ پس معلوم ہوا کہ رحمٰن میں مبالغہ بہ نسبت رحیم کے بہت زیادہ ہے۔ لیکن حدیث کی ایک دعا میں یَا رَحْمٰنَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَرَحِیْمَھُمَا بھی آیا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ یہ نام بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے سوا دوسرے کا نام نہیں۔ جیسا کہ فرمان ہے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو جس نام سے چاہو اُسے پکارو۔ اس کے بہت بہت اچھے اچھے نام ہیں ایک اور آیت میں وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا الخ یعنی اپنے سے پہلے کے رسولوں کو پوچھ لو کیا ان کے لیئے رحمٰن کے سوا کوئی اور معبود تھا جس کی عبادت وہ کرتے ہوں جب مسیلمہ کذاب نے دعوے شروع کئے اور اپنا نام رحمٰن الیلہ رکھا تو پروردگار نے اُسے بے انتہا رسوا اور برباد کیا اور جھوٹ اور کذب کے ساتھ وہ مشہور ہو گیا۔ آج اُسے مسیلمہ کذاب کہا جاتا ہے اور ہر جھوٹے دعویدار کو اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ ہر دیہاتی اور ہر شہری، پڑھے لکھے اور بے پڑھے لکھے گھر والا اسے بخوبی جانتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ رحیم میں رحمٰن سے زیادہ مبالغہ ہے اسلیئے کہ اس لفظ کیساتھ اگلے لفظ کی تاکید کی گئی ہے اور تاکید بہ نسبت اس کے جس کی تاکید کی جائے زیادہ قوت والی

ہوتی ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تاکید ہے ہی نہیں، بلکہ یہ توصفت ہے اور صفت میں یہ قاعدہ نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا جس نام میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کی صفت سب سے پہلے رحمٰن بیان کی گئی کہ یہ نام رکھنا بھی دوسروں کو ممنوع ہے۔ جیسے فرمایا کہ اللہ کو یا رحمٰن کو پکارو۔ جس نام سے چاہو پکارو اس کے لیئے اسماءِ حسنیٰ بہت سارے ہیں۔ مسیلمہ نے گو یہ بدترین جرأت کی لیکن برباد ہوا اور اس کے گمراہ ساتھیوں کے سوا اس کی یہ بات اوروں پر نہ چل سکی۔ رحیم کے وصف کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو بھی موصوف کیا ہے فرماتا ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ الخ اس آیت میں اپنے نبی کو رحیم کہا اسی طرح اپنے بعض ناموں سے دوسروں کو بھی اس نے یاد کیا جیسا کہ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ الخ میں انسان کو سمیع اور بصیر کہا ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض نام تو ایسے ہیں کہ دوسروں پر بھی دوسرے معنیٰ میں اُن کا اطلاق ہو سکتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے اللہ اور رحمٰن اور خالق اور رزاق وغیرہ اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے اپنا پہلا نام اللہ لیا پھر اس کی صفت رحمٰن سے کی اس لیے کہ رحیم کی نسبت یہ زیادہ خاص ہے اور زیادہ مشہور ہے قاعدہ ہے کہ اوّل سب سے زیادہ بزرگ نام سے نام لیا جائے اس لیئے سب سے پہلے سب سے زیادہ خاص نام لیا۔ پھر اُس سے کم۔ پھر اس سے کم۔ اگر کہا جائے کہ جب رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ موجود ہے پھر اس پر اکتفا کیوں نہ کی گئی؟ تو اس کے جواب میں حضرت عطا خراسانی کا یہ قول پیش ہو سکتا ہے کہ چونکہ کافروں نے رحمٰن نام بھی غیروں کا رکھ لیا تھا اس لیے رحیم کا لفظ بھی لائے تاکہ کسی قسم کا شائبہ تک نہ رہے۔ رحمٰن و رحیم صرف اللہ تعالیٰ ہی کا نام ہے ابن جریر نے اس قول کو نقل کیا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے کے عرب رحمٰن سے واقف ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی آیت قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ الخ نازل فرما کر ان کی تردید کی۔ کفار قریش نے حدیبیہ والے سال بھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھو کہا تھا کہ ہم رحمٰن و رحیم کو نہیں جانتے۔ بخاری میں یہ روایت موجود ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم رحمٰن یمامہ کو جانتے ہیں کسی اور رحمٰن کو نہیں جانتے اسی طرح اور جگہ قرآن پاک میں ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ الخ یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کے سامنے سجدہ کرو تو اور وحشت کرنے لگتے ہیں اور جواب دیتے ہیں کہ رحمٰن کون ہے۔ جسے ہم تیرے کہنے کی وجہ سے سجدہ کریں۔ ان سب کا صحیح مطلب یہ ہے کہ یہ بدکار لوگ صرف عناد اور تکبر سرکشی اور دشمنی کی بناء پر رحمٰن کا انکار کرتے تھے نہ کہ وہ اس نام سے ناآشنا تھے۔ اس لیئے کہ جاہلیت کے زمانے کے پرانے اشعار میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام رحیم موجود ہے۔ جاہلی شاعروں کے شعر ہیں۔ سلامہ کے شعر اور دیگر اشعار ملاحظہ ہوں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے تفسیر ابن جریر میں ہے کہ رحمٰن فعلان کے وزن پر رحمت سے ماخوذ ہے اور کلام عرب میں سے ہے۔ وہ خدا رفیق اور رقیق جس پر رحم کرنا چاہیے اور جس سے غصے ہو اس سے بہت دور اور اس پر بہت سخت گیر بھی ہے اسی طرح اس کے نام ہیں۔ حسن فرماتے ہیں، رحمٰن کا نام دوسروں کے لیے منع۔ خود اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ لوگوں کو اس نام کا کوئی حق نہیں۔ ام سلمہؓ والی حدیث جس میں ہے کہ ہر آیت پر حضورؐ ٹھہر کر رکتے تھے، پہلے گذر چکی ہے۔ ایک جماعت اسی طرح بسم اللہ الخ پر آیت کر کے اس کو الگ پڑھتی ہے۔ اور بعض ملا کر پڑھتے ہیں۔ میم کو دو ساکن جمع ہو جانے کی وجہ سے زیر دیتے ہیں۔ جمہور کا یہی قول ہے۔ کوئی کہتے ہیں کہ بعض عرب میم کے زبر سے پڑھتے ہیں ہمزہ کی حرکت زیر میم کو دیتے ہیں جیسے۔ الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ ابن عطیہ کہتے ہیں کہ زبر کی قرأت کسی سے بھی میرے خیال میں تو مروی نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر ختم ہوئی۔ اب آگے سورۃ فاتحہ کی تفسیر ملاحظہ کریں۔

# اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ ②

سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مُربّی ہیں ہر ہر عالم کے

ساتوں قاری اَلْحَمْدُ کو دال کے پیش سے پڑھتے ہیں اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کو مبتدا خبر مانتے ہیں۔ سفیان بن عیینہ اور رؤبہ بن عجاج کا قول ہے کہ دال کے زبر کے ساتھ ہے اور فعل یہاں مقدر ہے۔ ابن ابی عبلہ اَلْحَمْدُ کی دال کو اور لِلّٰهِ کے پہلے لام کو دونوں کو پیش کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس لام کو پہلے کے تابع کرتے ہیں گو اس کی شہادت زبانِ عرب سے ملتی ہے، لیکن شاذ ہے۔ حسن اور زید ابن علی ان دونوں حرفوں کو زیر سے پڑھتے ہیں اور لام کے تابع دال کو کرتے ہیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنیٰ یہ ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ اس کے سوا کوئی اس کے لائق نہیں خواہ وہ مخلوق میں سے کوئی بھی ہو۔ اس وجہ سے کہ تمام نعمتیں جنہیں ہم گن بھی نہیں سکتے اور سوا اس مالک کے اور کوئی ان کی تعداد کو نہیں جانتا۔ اسی کی طرف سے ہیں۔ اسی نے اپنی اطاعت کرنے کے تمام اسباب ہمیں عطا فرمائے اسی نے اپنے فرائض پورے کرنے کیلئے جسمانی تمام نعمتیں ہمیں انعام دیں۔ پھر دنیاوی بے شمار نعمتیں اور زندگی کی تمام ضروریات ہمارے کسی حق کے بغیر ہمیں اس نے ہبہ کیں۔ اس کی ہمیشگی والی نعمتیں اس کے تیار کردہ پاکیزہ مقام جنت میں ہم کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ بھی اس نے ہمیں سکھا دیا۔ پس ہم تو کہتے ہیں کہ اول آخر اسی مالک کی پاک ذات ہر طرح کی تعریف اور حمد و شکر کے لائق ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یہ ثنا کا کلمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ثنا خود آپ کی ہے اور اسی ضمن میں گویا یہ فرما دیا ہے کہ تم کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بعضوں نے کہا ہے کہ الحمد للہ کہنا یہ اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ ناموں اور اس کی بلند و بالا صفتوں سے اس کی ثنا کرنا ہے اور اَلشُّکْرُ لِلّٰهِ کہنا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے احسان کا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن یہ قول ٹھیک نہیں اس لیئے کہ زبانِ عرب کو جاننے والے علماء کا اتفاق ہے کہ شکر کی جگہ حمد کا لفظ اور حمد کی جگہ شکر کا لفظ بولتے ہیں۔ جعفر صادق اور ابن عطا صوفی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہر شکر کرنے والے کا کلمہ الحمد للہ ہے۔ قرطبی نے ابن جریر کے قول کو معتبر کرنے کیلئے یہ دلیل بھی بیان کی ہے کہ اگر کوئی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ شُکْرًا کہے تو جائز ہے۔ دراصل علامہ ابنِ جریر کے اس دعوے میں کلام ہے۔ پچھلے علماء میں مشہور ہے کہ حمد کہتے ہیں زبانی تعریف بیان کرنے کو خواہ جس کی حمد کی جاتی ہو اس کی لازم صفتوں پر ہو یا متعدی صفتوں پر۔ اور شکر صرف متعدی صفتوں پر ہوتا ہے اور وہ دل زبان اور جملہ ارکان سے ہوتا ہے۔ عرب شاعروں کے اشعار بھی اس پر دلیل ہیں۔ ہاں اس میں اختلاف ہے کہ حمد کا لفظ عام ہے یا شکر کا۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اس میں عموم خصوص ہے اس حیثیت سے کہ جس پر واقع ہوں حمد کا لفظ شکر کے لفظ سے عام ہے اسلیئے کہ وہ لازم اور متعدی دونوں اوصاف پر آتا ہے۔ قدوسیت اور کرم دونوں پر حَمِدْتُهٗ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس حیثیت سے کہ وہ صرف زبان سے ہی ادا ہو سکتا ہے۔ یہ لفظ خاص ہے اور شکر کا لفظ عام ہے۔ کیونکہ وہ قول و فعل نیت تینوں پر بولا جاتا ہے اور صرف متعدی صفتوں پر بولے جانے کے اعتبار سے شکر کا لفظ خاص ہے۔ قدوسیت پر شَکَرْتُهٗ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ شَکَرْتُهٗ عَلٰی کَرَمِهٖ وَاِحْسَانِهٖ اِلَیَّ کہہ سکتے ہیں۔ یہ تھا خلاصہ متاخرین کے قول کا۔ واللہ اعلم۔

ابو نصر اسماعیل بن حماد جوہری کہتے ہیں حمد مقابل ہے ذم کے یوں کہتے ہیں حَمِدْتُ الرَّجُلَ اَحْمَدُهٗ حَمْدًا وَّمَحْمَدَةً فَهُوَ حَمِیْدٌ وَّمَحْمُوْدٌ۔ تحمید میں حمد سے بھی زیادہ مبالغہ ہے۔ حمد شکر سے عام ہے۔ شکر کہتے ہیں کسی محسن کی دی ہوئی نعمتوں پر اس کی ثنا کرنے کو عربی زبان میں شَکَرْتُهٗ اور شَکَرْتُ لَهٗ دونوں طرح کہتے ہیں۔ لیکن لام کے ساتھ کہنا زیادہ فصیح ہے۔ مدح کا لفظ حمد سے بھی زیادہ عام ہے اس لیے کہ زندہ مردہ بلکہ جمادات پر بھی مدح کا لفظ بول سکتے ہیں۔ کھانے کی اور مکان کی اور ایسی ہی اور چیزوں کی مدح کی جاتی ہے۔ احسان سے پہلے احسان کے بعد لازم صفتوں پر متعدی صفتوں پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو اس کا عام ہونا ثابت ہوا۔ واللہ اعلم۔

## حمد کی تفسیر اقوال سلف سے

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور بعض روایتوں میں ہے کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کو تو ہم جانتے ہیں لیکن یہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا کیا مطلب؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ اس کلمہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے پسند فرمالیا ہے اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا کہنا خدا کو بھلا لگتا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ کلمہ شکر کا ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے میرا شکر کیا پس اس کلمہ میں شکر کے علاوہ اس کی نعمتوں۔ ہدایتوں احسان وغیرہ کا اقرار بھی ہے۔ کعب احبارؒ کا قول ہے کہ یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کی ثنا ہے۔ ضحاک کہتے ہیں یہ خدا کی چادر ہے۔ ایک حدیث بھی ایسی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب تم نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ کہہ لیا تو تم نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا لیا۔ اب اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دیگا۔ اسود بن سریع ایک مرتبہ حضورؐ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ میں نے ذات باری تعالیٰ کی حمد میں چند اشعار کہے ہیں اگر اجازت ہو تو سنادوں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کو اپنی حمد بہت پسند ہے (مسند احمد ونسائی) ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افضل ذکر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اور افضل دعا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ہے۔ امام ترمذی اس حدیث کو حسن غریب کہتے ہیں ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دے اور وہ اس پر الحمد للہ کہے تو دی ہوئی نعمت لی ہوئی سے افضل ہے فرماتے ہیں۔ اگر میری امت میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ دنیا دیدے اور وہ الحمد للہ کہے تو یہ کلمہ ساری دنیا سے افضل ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا دیدینا اتنی بڑی نعمت نہیں جتنی الحمد للہ کہنے کی توفیق دینا ہے اس لیئے کہ دنیا تو فانی ہے اور اس کلمہ کا ثواب باقی ہے۔ جیساکہ قرآن پاک میں ہے اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ الخ یعنی مال اور اولاد دنیا کی زینت ہیں۔ اور نیک اعمال ہمیشہ باقی رہنے والے ثواب والے اور نیک اُمید والے ہیں۔ ابن ماجہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص نے ایک مرتبہ کہا یَا رَبِّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْھِکَ وَعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ فرشتے گھبرا اٹھے کہ ہم اس کا کتنا اجر لکھیں۔ آخر اللہ تعالیٰ سے انہوں نے عرض کی کہ تیرے ایک بندے نے ایک ایسا کلمہ کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے اُسے کس طرح لکھیں؟ پروردگار نے باوجود جاننے کے ان سے پوچھا کہ اس نے کیا کہا ہے؟ انہوں نے بیان کیا کہ اس نے یہ کلمہ کہا ہے۔ فرمایا تم یوں ہی اسے لکھ لو میں آپ اسے ملاقات کے وقت اس کا اجر دوں گا۔ قرطبی ایک جماعت علماء سے نقل کرتے ہیں کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ افضل ہے کیونکہ اس میں توحید اور حمد دونوں ہیں اور علماء کا خیال ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ افضل ہے اس لیئے کہ ایمان وکفر میں یہی فرق کرتا ہے اسی کے کہلوانے کے لیئے کفار سے لڑائیاں کیجاتی ہیں جیساکہ صحیح بخاری صحیح مسلم کی حدیث میں ہے۔ ایک اور مرفوع حدیث میں ہے کہ جو کچھ میں نے اور مجھ سے پہلے کے تمام انبیاء کرام نے کہا ہے ان میں سب سے افضل لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ہے۔ حضرت جابرؓ کی ایک مرفوع حدیث پہلے گذر چکی ہے کہ افضل الذکر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور افضل دعا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ الحمد میں الف، لام استغراق کا ہے یعنی حمد کی تمام قسمیں اور جنسیں سب کی سب صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیئے ثابت ہیں۔ جیساکہ حدیث میں ہے کہ باری تعالیٰ تیرے ہی لیئے تمام تعریفیں ہیں اور تمام ملک ہے تیرے ہی ہاتھ تمام بھلائیاں ہیں اور تمام کام تیری ہی طرف لوٹتے ہیں رب کہتے ہیں مالک اور متصرف کو لغت میں اس کا اطلاق سردار اور اصلاح کے لیئے ہیر پھیر کرنے والے پر بھی ہوتا ہے اور ان سب معانی کے اعتبار سے ذات باری کے لیئے یہ پاک نام زیب دیتا ہے۔ رب کا لفظ ہی سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے پر نہیں کہا جا سکتا، ہاں اضافت کے ساتھ ہو تو اور بات ہے۔ جیسے۔ رَبُّ الدَّارِ یعنی گھر کا پالنے والا وغیرہ بعض کا تو قول ہے کہ اسم اعظم یہی ہے۔ عٰلَمِیْنَ ۝ جمع ہے عالَم کی اللہ تعالیٰ کے سوا تمام مخلوق کو عالم کہتے ہیں۔ لفظ عالم بھی جمع ہے اور اس کا واحد لفظاً ہے ہی نہیں۔ آسمان کی مخلوق خشکی اور تری کی مخلوقات کو بھی عوالم یعنی کئی عالم کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک ایک زمانے اور ایک ایک وقت کو بھی عالم کہا جاتا ہے

ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر سے مروی ہے کہ اس سے مراد کُل مخلوق ہے۔ خواہ آسمانوں کی ہو یا زمینوں کی یا ان کے درمیان کی خواہ ہمیں اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ انہی سے اس کی مراد جنّات اور انسان بھی روایت کی گئی ہے سعید بن جبیر مجاہد اور ابن جریج سے بھی یہ مروی ہے۔ حضرت علیؓ سے بھی غیر معتبر سند سے یہ منقول ہے۔ اس قول کی دلیل قرآن کی آیت لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ بھی بیان کی جاتی ہے۔ یعنی تاکہ وہ العٰلَمِیْنَ یعنی جن اور انس کے لیئے ڈرانے والا ہو جائے۔ فرا اور ابو عبیدہ کا قول ہے کہ سمجھ دار کو عالم کہا جاتا ہے۔ انسان جنّات فرشتے شیاطین انہیں عالم کہا جائیگا۔ جانوروں کو نہیں کہا جائے گا۔ زید بن اسلم اور محیص فرماتے ہیں کہ ہر روح والی چیز کو عالم کہا جاتا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ہر قسم کو ایک عالم کہتے ہیں۔ ابن مروان بن حکم عرف جعد جن کا لقب حمار تھا جو بنو امیہ میں سے ہیں اور اپنے زمانے کے خلیفہ تھے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سترہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں۔ آسمانوں والے سب ایک عالم زمینوں والے سب ایک عالم اور باقی کو خدا ہی جانتا ہے مخلوق کو ان کا علم نہیں۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں انسان کل ایک عالم ہے سارے جنات کا ایک عالم ہے اور ان کے سوا اٹھارہ ہزار یا چودہ ہزار عالم اور ہیں۔ فرشتے زمین پر ہیں اور زمین کے چار کونے ہیں ہر کونے میں ساڑھے تین ہزار عالم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ قول بالکل غریب ہے اور ایسی باتیں جب تک کسی صحیح دلیل سے ثابت نہوں، ماننے کے قابل نہیں ہوتیں۔ حمیری کہتے ہیں ایک ہزار امتیں ہیں چھ سو تو تری میں اور چار سو خشکی میں سعید بن مسیب سے بھی یہ مروی ہے۔ ایک ضعیف روایت میں ہے کہ حضرت فاروقؓ کی خلافت کے زمانے میں ایک سال ٹڈیاں نظر نہیں آئیں، بلکہ دریافت کرنے پر بھی پتہ نہ چلا۔ آپ غمگین ہو گئے اور یمن، شام اور عراق کی طرف سوار دوڑا دیئے کہ کہیں بھی ٹڈیاں نظر آتی ہیں یا نہیں تو یمن والے سوار تھوڑی سی ٹڈیاں لیکر آئے اور امیر المومنین کے سامنے پیش کیں۔ آپ نے انہیں دیکھ کر تکبیر کہی اور فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔ آپ فرماتے تھے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار اُمتیں پیدا کی ہیں جن میں چھ سو تو تری میں ہیں اور چار سو خشکی میں ان میں سے سب سے پہلے جو امت ہلاک ہوگی وہ ٹڈیاں ہونگی۔ پس ان کی ہلاکت کے بعد پے درپے اور سب امتیں ہلاک ہو جائیں گی جس طرح کہ تسبیح کا تاگا ٹوٹ جائے اور ایک کے بعد ایک کر کے سب موتی جھڑ جاتے ہیں لیکن اس روایت کے راوی محمد بن عیسیٰ ہلالی ضعیف ہیں۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے بھی یہ قول مروی ہے۔ وہیب بن منبہ فرماتے ہیں اٹھارہ ہزار عالم ہیں دنیا ساری کی ساری ان میں ایک عالم ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں چالیس ہزار عالم ہیں۔ ساری دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔ زجاج کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ سب عالم ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ یہی قول صحیح ہے اس لیئے کہ یہ تمام عالمین کو شامل ہے۔ جیسے فرعون کے اس سوال کے جواب میں کہ رب العالمین کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ آسمانوں زمینوں اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کا رب۔ عالم کا لفظ علامت سے مشتق ہے اس لیئے کہ عالم یعنی مخلوق اپنے پیدا کرنے والے اور بنانے والے پر نشان اور اس کی وحدانیت پر علامت ہے جیسے کہ ابن معتز شاعر کا قول ہے ؎

فَیَا عَجَبًا کَیْفَ یَعْصِی الْاِلٰهُ + اَمْ کَیْفَ یَجْحَدُهُ الْجَاحِدُ + وَفِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهُ اٰیَةٌ + تَدُلُّ عَلٰی اِنَّهُ وَاحِدُ

یعنی تعجب ہے کس طرح خدا کی نافرمانی کی جاتی ہے اور کس طرح اُس سے انکار کیا جاتا ہے، حالانکہ ہر چیز میں ایک ایسی نشانی ہے جو اس کی وحدانیت پر واضح دلالت کرتی ہے۔

اَلْحَمْدُ الخ کے بعد اب اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ کی تفسیر سنئے۔

## اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ②

جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

اس کی تفسیر پہلے پوری گذر چکی ہے۔ اب اعادہ کی ضرورت نہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے وصف کے بعد اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کا وصف ترہیب یعنی ڈراوے کے بعد ترغیب یعنی امید ہے۔ جیسے فرمایا نَبِّئْ عِبَادِيْٓ الخ یعنی میرے بندوں کو خبر کر دو کہ میں بخشنے والا مہربان بھی ہوں اور میرے عذاب بھی دردناک عذاب ہیں۔ اور فرمایا تیرا رب جلد سزا کرنے والا اور مہربانی اور بخشش بھی کرنے والا ہے رب کے لفظ میں تخویف ہے اور رحمٰن اور رحیم کے لفظ میں امید ہے۔ صحیح مسلم شریف میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ایمان دار خدا کے غضب و غصہ سے اور اس کے سخت عذابوں سے پورا واقف ہوتا (تو اس وقت) اس کے دل سے جنت کی طمع ہٹ جاتی اور اگر کافر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی رحمتوں کو پوری طرح جان لیتا تو کبھی ناامید نہ ہوتا

## مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ③

جو مالک ہیں روز جزا کے

بعض قاریوں نے مَلِكِ پڑھا ہے اور باقی سب نے مَالِكِ اور دونوں قرأتیں صحیح اور متواتر ہیں اور سات قرأتوں میں سے ہیں۔ اور مالك کے لام کو زیر اور اس کے سکون کے ساتھ اور مَلِيْكِ اور مَلِكِيْ بھی پڑھا گیا ہے۔ پہلے دونوں قرأتیں معنی کی رو سے ترجیح والی ہیں اور دونوں صحیح ہیں اور اچھی ہیں۔ زمخشری نے مَلِكِ کو ترجیح دی ہے۔ اس لئے کہ حرمین والوں کی یہ قرأت ہے اور قرآن میں بھی اَلْمُلْكُ الْيَوْمَ اور قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے مَلِكِ پڑھا اس بنا پر کہ فَعِلٌ اور فَاعِلٌ اور مَفْعُوْلٌ آتا ہے لیکن یہ شاذ ہے اور بے حد غریب ہے۔ ابوبکر بن ابوداؤد نے اس میں ایک اور غریب روایت پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تینوں خلفاء اور حضرت معاویہؓ اور ان کے لڑکے مَالِكِ پڑھتے تھے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مروان نے مَلِكِ پڑھا لیکن ہمارا خیال ہے کہ مروان کو اپنی اس قرأت کی صحت پر اطلاع تھی جو راوی حدیث ابن شہاب کو نہ تھی واللہ اعلم۔ ابن مردویہ نے کئی سندوں سے اسے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مَالِكِ پڑھتے تھے۔ مالک کا لفظ مِلْک سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ الخ یعنی زمین اور اس کے اوپر کی تمام مخلوق کے مالک ہم ہی ہیں اور ہماری ہی طرف سب لوٹائے جائیں گے اور فرمایا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ یعنی کہہ کہ میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے رب اور لوگوں کے مالک کی اور مَلِک کا لفظ مُلْک سے ماخوذ ہے۔ جیسے فرمایا اَلْمُلْكُ الْيَوْمَ الخ یعنی آج ملک کس کا ہے۔ صرف اللہ واحد غلبہ والے کا۔ اور فرمایا قَوْلُهُ الْحَقُّ الخ اسی کا فرمان حق ہے اور اسی کا سب ملک ہے۔ اور فرمایا آج کے دن ملک رحمٰن ہی کا حق ہے اور آج کا دن کافروں پر بہت سخت ہے۔ اس فرمان میں قیامت کے دن کے ساتھ ملکیت کی تخصیص کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ قیامت کے علاوہ اور چیزوں کو اپنا مملوک قرار دینے سے انکار کیا جا رہا ہے اس لئے کہ پہلے اپنا وصف رب العالمین ہونا بیان فرما چکا ہے جو دنیا و آخرت کو شامل ہے۔ قیامت کے دن کے ساتھ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس دن تو کوئی ملکیت کا

دعویدار بھی نہ ہوگا۔ بلکہ بغیر اس حقیقی مالک کی اجازت کے کوئی زبان تک نہ ہلا سکے گا۔ جیساکہ فرمایا جس دن روح اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے اور کوئی کلام نہ کر سکیگا یہاں تک کہ رحمٰن اُسے اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔ اور جگہ ارشاد ہے۔ سب آوازیں رحمٰن کے سامنے پست ہونگی اور سوا گنگناہٹ کے کچھ نہ سنائی دیگا اور فرمایا جب قیامت آئیگی اس دن بغیر خداوند تبارک وتعالیٰ کی اجازت کے کوئی شخص بول نہ سکے گا۔ بعض اُن میں سے بدبخت ہوں گے اور بعض سعادت مند۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس دن اس کی بادشاہت میں اس کے سوا کوئی نہ ہوگا۔ جیساکہ دنیا میں مجازاً تھے۔ یَوْمِ الدِّیْنِ سے مراد مخلوق کے حساب کا یعنی قیامت کا دن ہے۔ جس دن تمام بھلے بُرے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ ہاں اگر رب کسی برائی سے درگذر کرے یہ اس کا اختیاری امر ہے۔ صحابہؓ تابعین اور سلف صالحین سے بھی یہ مروی ہے بعض سے یہ بھی منقول ہیکہ مراد اس سے یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ قیامت کے قائم کرنے پر قادر ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن بظاہر ان دونوں قول میں کوئی مخالفت نہیں ہر ایک قول کا قائل دوسرے کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔ ہاں پہلا قول مطلب پر زیادہ دلالت کرتا ہے جیساکہ فرمان ہے اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِنِ الخ اور دوسرا قول اس آیت کے مشابہ ہے جو فرمایا وَیَوْمَ یَقُوْلُ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ یعنی جس دن کہے گا ہو جا بس اُسی وقت ہو جائیگی۔ واللہ اعلم۔ حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جیسے فرمایا هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الخ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدترین نام اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس شخص کا ہے جو شہنشاہ کہلائے حقیقی مالک اللہ کے سوا کوئی نہیں اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو قبضہ میں لے لیگا اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے پھر فرمائیگا میں بادشاہ ہوں کہاں گئے زمین کے بادشاہ، کہاں ہیں تکبر والے۔ قرآن عظیم میں ہے آج بادشاہت کس کی ہے؟ فقط اللہ اکیلے غلبہ والے کی اور کسی کو مَلِک کہدینا یہ صرف مجازاً ہے جیساکہ قرآن میں طالوت کو مَلِک کہا گیا اور وَکَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ کا لفظ آیا اور بخاری ومسلم میں مُلُوْکٌ کا لفظ آیا ہے اور قرآن کی ایک آیت میں ہے اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا یعنی تم میں انبیاء کئے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔ دین کے معنی بدلے جزا اور حساب کے ہیں۔ جیساکہ قرآن پاک میں ہیں۔ اس دن اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا بدلہ دے گا اور وہ جان لیں گے۔ ایک اور جگہ ہے کیا ہم بدلہ دئے جائیں گے؟ حدیث میں ہے دانا وہ ہے جو اپنے نفس سے خود بدلہ لے اور موت کے بعد کام آنے والے اعمال کرے یعنی اپنے نفس سے خود حساب لے۔ جیساکہ حضرت فاروق اعظمؓ کا قول ہے کہ تم خود اپنی جانوں سے حساب لو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے اور اپنے اعمال کا خود وزن کر لو اس سے پہلے کہ وہ ترازو میں رکھے جائیں اور اُس بڑی پیشی کیلئے تیار رہو جب تم اس خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے جس پر تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں جیساکہ خود خداوند عالم نے فرمایا جس دن تم پیش کئے جاؤ گے تو کوئی بات خدا پر چھپنے کی نہیں۔

## اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ④

ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں

ساتوں قاریوں اور جمہور نے اسے اِیَّاکَ پڑھا ہے۔ عمرو بن فائد نے اِیَاکَ پڑھا۔ لیکن یہ قرأۃ شاذ اور امر دور ہے۔ اس لیئے کہ اِیَا کے معنی سورج کی روشنی کے ہیں۔ اور بعضوں نے آیَاکَ پڑھا ہے۔ اور بعضوں نے هَیَّاکَ پڑھا ہے۔ عرب شاعروں کے شعر میں بھی هَیَّاکَ ہے۔ نَسْتَعِیْنُ کی یہی قرأت تمام کی ہے سوائے یحییٰ بن وثاب اور اعمش کے یہ دونوں پہلے نون کو زیر سے پڑھتے ہیں۔ قبیلہ بنو اسد ربیعہ بنو تمیم کا لغت اسی طرح پر ہے۔ لغت میں عبادت کہتے ہیں ذلت اور پستی۔ طریق معبد اُس راستے کو کہتے ہیں جو ذلیل ہو۔ اسی طرح بَعِیْرٌ مُّعَبَّدٌ اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو ذلیل ہو۔ اور شریعت میں عبادت

نام ہے محبت خشوع خضوع اور خوف کے مجموعے کا۔ لفظ اِیَّاکَ کو جو مفعول ہے پہلے لائے اور پھر اُسی کو دوہرایا تاکہ اسکی اہمیت ہو جائے اور عبادت اور طلب مدد اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہو جائے۔ تو اس جملے کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور تیرے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ کامل اطاعت اور پورے دین کا حاصل صرف یہی دو چیزیں ہیں بعض سلف کا فرمان ہے کہ سارے قرآن کا راز سورۂ فاتحہ میں ہے اور پوری سورت کا راز اس آیت اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝ میں ہے۔ آیت کے پہلے جز میں شرک سے بیزاری کا اعلان ہے اور دوسرے جملے میں اپنی طاقتوں اور قوتوں کا انکار ہے اور اللہ عزوجل کی طرف اپنے کاموں کی سپردگی ہے۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ جیسے فرمایا۔ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ الخ یعنی اللہ ہی کی عبادت کرو اور اُسی پر بھروسہ کرو، تمہارا رب تمہارے اعمال سے غافل نہیں فرمایا۔ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ الخ کہدے کہ وہی رحمان ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور اسی پر ہم نے توکل کیا۔ فرمایا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا ۝ یعنی مشرق مغرب کا رب وہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اُسی کو اپنا کارساز سمجھ۔ یہی مضمون اس آیۂ کریمہ میں ہے۔ اس سے پہلے کی آیتوں میں تو خطاب نہ تھا۔ لیکن آیت میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کیا گیا جو نہایت لطافت اور مناسبت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ جب بندے نے اللہ تعالیٰ کی صفت و ثنا بیان کی تو گویا قرب خداوندی میں حاضر ہو گیا اور خداوند جل وعلا کے حضور میں پہنچ گیا، اب اس مالک کو خطاب کر کے اپنی ذلت اور مسکینی کا اظہار کرنے لگا اور کہنے لگا کہ خدایا ہم تو تیرے ذلیل غلام ہیں اور اپنے تمام کاموں میں تیرے ہی محتاج ہیں۔ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس سے پہلے کے تمام جملوں میں خبر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بہترین صفات پر اپنی ثنا آپ کی تھی اور بندوں کو اپنی ثنا انہی الفاظ کے ساتھ بیان کرنے کا ارشاد فرمایا تھا۔ اسی لئے اُس شخص کی نماز صحیح نہیں جو اس سورت کو پڑھنا جانتا ہو اور پھر نہ پڑھے جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کی نماز نہیں کہا جا سکتا جو سورۂ فاتحہ اپنی نماز میں نہ پڑھے۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف بانٹ لیا ہے اس کا آدھا حصہ میرا ہے اور آدھا حصہ میرے بندے کیلئے ہے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو وہ طلب کرے۔ جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی جب کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ خدا فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی جب وہ کہتا ہے مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ خدا فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی جب وہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو مانگے پھر وہ آخر سورت تک پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کیلئے ہے اور میرا بندہ جو مجھ سے مانگے اُس کیلئے ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے معنیٰ یہ ہیں کہ اے ہمارے رب ہم خاص تیری ہی توحید مانتے ہیں اور تجھی سے ڈرتے ہیں اور تیری ہی ذات سے اُمید رکھتے ہیں تیرے سوا کسی اور کی نہ تو ہم عبادت کریں نہ ڈریں نہ اُمید رکھیں اور اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سے مراد یہ ہے کہ ہم تیری تمام اطاعت پر اور اپنے تمام کاموں میں تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم سب اُسی کی خالص عبادت کرو اور اپنے تمام کاموں میں اُسی سے مدد مانگو اِیَّاكَ نَعْبُدُ کو پہلے لانا اسلئے ہے کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی ہے اور مدد طلب کرنا یہ عبادت کا وسیلہ اور اہتمام اور اس پر پختگی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زیادہ اہمیت والی چیز کو آگے کیا جاتا ہے اور اس سے کم کو اس کے بعد لایا جاتا ہے واللہ اعلم اگر یہ کہا جائے کہ یہاں جمع کے صیغہ کو لانے کی یعنی ہم کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہ جمع کیلئے ہے تو کہنے والا تو ایک ہے اور اگر تعظیم کیلئے ہے تو اس مقام پر یہ نہایت نامناسب ہے۔ کیونکہ یہاں تو مسکینی اور عاجزی ظاہر کرنا مقصود ہے اس کا جواب

یہ ہے کہ گویا ایک بندہ تمام بندوں کی طرف سے خبر دے رہا ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ جماعت میں کھڑا ہو یا امام بنا ہوا ہو۔ پس گویا وہ اپنی اور اپنے سب مؤمن بھائیوں کی طرف سے اقرار کر رہا ہے کہ وہ سب اُس کے بندے ہیں اور اسی کی عبادت کیلئے پیدا کئے گئے ہیں اور یہ اُن کی طرف سے بھلائی کیلئے آگے بڑھا ہوا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہ تعظیم کیلئے ہے گویا کہ بندہ جب عبادت میں داخل ہوتا ہے تو اسی کو کہا جاتا ہے کہ تو شریف ہے اور تیری عزت ہمارے دربار میں بہت زیادہ ہے تو اب اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہہ اپنے تئیں عزت سے یاد کر۔ ہاں اگر عبادت سے الگ ہو تو اس وقت ہم نہ کہہ گو ہزاروں لاکھوں میں ہو، کیونکہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محتاج اور اس کے دربار کے فقیر ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں جو تواضع اور عاجزی ہے وہ اِیَّاكَ عَبَدْنَا میں نہیں اس لئے کہ اس میں اپنے نفس کی بڑائی اور اپنی عبادت کی اہلیت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی پوری عبادت اور جیسی چاہیئے ویسی ثنا و صفت بیان کرنے پر قدرت ہی نہیں رکھتا۔ کسی شاعر کا قول ہے کہ مجھے اُس کا غلام کہہ کر ہی پکارو۔ کیونکہ میرا سب سے اچھا نام یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام عبد یعنی غلام ان جگہوں پر لیا ہے جہاں اپنی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر کیا ہے جیسے قرآن نازل کرنا۔ نماز میں کھڑے ہونا معراج کرانا وغیرہ فرمان ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الخ فرمایا وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ الخ سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ الخ ساتھ ہی قرآن پاک نے یہ تعلیم دی کہ اے نبی جس وقت تمہارا دل مخالفین کے جھٹلانے کی وجہ سے تنگ ہو تو تم میری عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ فرمان ہے۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ الخ یعنی ہم جانتے ہیں کہ مخالفین کی باتیں تیرا دل دکھاتی ہیں تو ایسے وقت اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کر اور سجدہ کر اور موت کے وقت تک اپنے رب کی عبادت میں لگا رہ۔ رازی نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے نقل کیا ہے کہ عبودیت کا مقام رسالت کے مقام سے افضل ہے۔ کیونکہ عبادت کا تعلق مخلوق سے خالق کی طرف ہوتا ہے اور رسالت کا تعلق حق سے خلق کی طرف ہوتا ہے اور اس دلیل سے بھی کہ عبد کی کل اصلاح کے کاموں کا متولی خود خداوند تبارک و تعالیٰ ہوتا ہے اور رسول اپنی اُمت کی مصلحتوں کا والی ہوتا ہے۔ لیکن یہ قول غلط ہے اور اس کی یہ دونوں دلیلیں بھی کمزور اور لاحاصل ہیں۔ افسوس رازی نے نہ تو اس کو ضعیف کہا نہ اُسے رد کیا۔ بعض صوفیوں کا قول ہے کہ عبادت یا تو ثواب حاصل کرنے کیلئے ہوتی ہے یا عذاب دفع کرنے کیلئے وہ کہتے ہیں یہ کوئی فائدے کی بات نہیں۔ اس لئے کہ اس وقت مقصود خود اپنی مراد کا حاصل کرنا ٹھہرا۔ اُس کی تکالیف کے لئے آمادگی کرنا یہ بھی ضعیف ہے۔ اعلیٰ مرتبہ عبادت کا یہ ہے کہ انسان اُس مقدس ذات کی جو تمام کامل صفتوں سے موصوف ہے محض اُس کی ذات کیلئے ہی عبادت کرے اور مقصود کچھ نہ ہو۔ اسی لئے نماز کی نیت ۔ ۔ ۔ ۔ للہ نماز پڑھنے کی ہوتی ہے اگر وہ ثواب پانے اور عذاب سے بچنے کیلئے ہو تو باطل ہے۔ دوسرا گروہ ان کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عبادت کا اللہ تعالیٰ کیلئے ہونا کچھ اس کے خلاف نہیں کہ ثواب کی طلب اور عذاب کا بچاؤ مطلوب نہ ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک اعرابی نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر کہا کہ حضورؐ میں نہ تو آپ جیسا پڑھنا جانتا ہوں نہ حضرت معاذؓ جیسا۔ میں تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور جہنم سے نجات چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا اسی کے قریب قریب ہم بھی پڑھتے ہیں۔

## اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۵﴾

بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا

جمہور نے تو صِرَاط پڑھا ہے۔ بعضوں نے سِرَاط کہا ہے اور زے سے بھی ایک قرأۃ ہے۔ فرا کہتے ہیں بنی عذرہ اور بنی کلب کی قرأت یہی ہے چونکہ پہلے ثنا و صفت بیان کی تو اب مناسب تھا کہ اپنی حاجت طلب کرے جیسے کہ پہلے حدیث میں گذر چکا کہ اس کا آدھا حصہ میرے لئے ہے اور آدھا میرے بندے کیلئے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو وہ طلب کرے۔ خیال کیجئے کہ اسمیں کسقدر

لطافت اور عمدگی ہے کہ پہلے پروردگار عالم کی تعریف و توصیف کی پھر اپنی اور اپنے بھائیوں کی حاجت طلب کی۔ یہ وہ لطیف پیرایہ ہے جو مقصود کو حاصل کرنے اور مراد کو پالینے کے لئے تیر بہدف ہے۔ اس کامل طریقہ کو پسند فرما کر خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس کی ہدایت کی۔ کبھی سوال اس طرح ہوتا ہے کہ سائل اپنی حالت اور حاجت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ۔ پروردگار جو بھلائیاں تو نے میری طرف نازل فرمائی ہیں میں ان کا محتاج ہوں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے بھی اپنی دعا میں کہا لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ خدایا تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے۔ میں ظالموں میں سے ہوں۔ کبھی سوال اسطرح بھی ہوتا ہے کہ سائل صرف تعریف اور بزرگی بیان کر کے چپ ہو جاتا ہے۔ جیسے شاعر کا قول ہے کہ مجھے اپنی حاجت کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تیری مہربانیوں بھری بخشش مجھے کافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ داد و دہش تیری پاک عادتوں میں داخل ہے۔ صرف تیری پاکیزگی بیان کر دینا، تیری حمد و ثنا کرنا ہی مجھے اپنی حاجت پوری کرنے کے کافی ہے۔ ہدایت کے معنی یہاں پر ارشاد اور توفیق کے ہیں۔ کبھی تو ہدایت بنفسہٖ متعدی ہوتی ہے۔ جیسے یہاں ہے تو اَلْھِمْنَا وَفِّقْنَا اُرْزُقْنَا اور اَعْطِنَا یعنی ہمیں عطا فرما کے ہونگے اور جگہ ہے وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ ۝ یعنی ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے بھلائی اور برائی دونوں کے۔ اور کبھی ہدایت اِلیٰ کے ساتھ متعدی ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا۔ اِجْتَبٰہُ وَھَدٰہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ اور فرمایا فَاھْدُوْھُمْ اِلٰی صِرَاطِ الْجَحِیْمِ ۝ یہاں ہدایت ارشاد اور دلالت کے معنی میں ہے۔ اسی طرح فرمان ہے وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی یعنی تو البتہ سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ اور کبھی ہدایت لام کیساتھ متعدی ہوتی ہے۔ جیسے جنتیوں کا قول قرآن کریم میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا۔ یعنی خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس کی راہ دکھائی یعنی توفیق دی اور ہدایت والا بنایا۔ صراط مستقیم کے معنی متعدد ہیں۔ امام ابو جعفر ابن جریر فرماتے ہیں کہ مراد اس سے واضح اور صاف راستہ ہے جو کہیں سے ٹیڑھا نہ ہو۔ عرب کے لغت میں اور شاعروں کے شعر میں یہ معنی صاف طور پر پائے جاتے ہیں اور اس کے بے شمار شاہد موجود ہیں۔ صراط کا استعمال استعارۃً قول اور فعل میں بھی ہوتا ہے اور پھر صراط کی صفت کبھی استقامت ہوتی ہے اور گاہے کجی۔ سلف اور خلف مفسرین سے اس کی بہت سی تفسیریں منقول ہیں اور اُن سب کا خلاصہ ایک ہے اور وہ خدا اور رسول کی پیروی اور تابعداری ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ صراط مستقیم کتاب اللہ ہے (ابن ابی حاتم) اسی طرح ابن جریر نے بھی روایت کی ہے۔ فضائل قرآن کے بارے میں پہلے حدیث گذر چکی ہے کہ خدا تعالیٰ کی مضبوط رسی، حکمتوں والا ذکر اور سیدھی راہ یعنی صراط مستقیم یہی خدا کی کتاب قرآن کریم ہے (مسند احمد ترمذی) حضرت علیؓ کا قول بھی یہی ہے اور مرفوع حدیث کا بھی موقوف ہونا ہی زیادہ مشابہ ہے واللہ اعلم۔ حضرت عبداللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ جبرئیل السلام نے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ کہئے۔ یعنی ہمیں ہدایت والے راستہ کا الہام کر اور اس دین خدا کی سمجھ دے جس میں کوئی کجی نہیں۔ آپ سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اور بہت سے صحابہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے جو ہر اس چیز سے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے زیادہ وسعت والا ہے۔ ابن حنفیہ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جس کے سوا اور دین مقبول نہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا قول ہے کہ صراط مستقیم اسلام ہے۔ مسند احمد کی ایک حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی صراط مستقیم کی کہ اس کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں ان میں کئی ایک کھلے ہوئے دروازے ہیں اور دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں۔ صراط مستقیم کے دروازے پر ایک پکارنے والا مقرر ہے جو کہتا ہے کہ اے لوگو! تم سب کے سب اسی سیدھی راہ پر چلے جاؤ ٹیڑھی ترچھی ادھر اُدھر کی راہوں پر نہ لگو۔ ایک پکارنے والا اس راستے کے اوپر ہے جب کوئی شخص اُن دروازوں میں سے کسی کو کھولنا چاہتا ہے تو وہ کہتا ہے خبردار اسے نہ کھولنا۔ اگر کھولا تو اس راہ لگ جائیگا اور صراط مستقیم سے ہٹ جائیگا۔ پس صراط مستقیم تو اسلام ہے اور دیواریں اللہ کی حدیں ہیں اور کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ

کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور دروازے پر پکارنیوالا قرآن کریم ہے اور راستے کے اوپر سے پکارنے والا خوف الٰہی ہے جو ہر ایماندار کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور واعظ کے ہوتا ہے یہ حدیث ابن ابی حاتم ابن جریر ترمذی اور نسائی میں بھی ہے اور اس کی اسناد حسن صحیح ہے واللہ اعلم۔ مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد حق ہے۔ ان کا یہ قول سب سے زیادہ جامع ہے اور ان سب اقوال میں باہم کوئی تضاد نہیں۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد کے آپ کے دونوں خلفاء ہیں۔ ابوالعالیہ اس قول کی تصدیق اور تحسین کرتے ہیں۔ دراصل یہ سب اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے سے موافق ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے دونوں خلفاء صدیق و فاروق کا تابعدار حق کا تابع ہے اور حق کا تابع اسلام کا تابع قرآن کا مطیع ہے اور قرآن خدا کی کتاب اُسکی طرف کی مضبوط رسی اور اس کی سیدھی راہ ہے پھر صراط مستقیم کی تفسیر میں یہ تمام اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے فالحمد للہ۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں صراط مستقیم وہ ہے جس پر ہمیں رسول اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا۔ امام ابو جعفر بن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ ہے کہ میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر میں سب سے اولیٰ یہ ہے کہ ہم توفیق دیئے جائیں اس چیز کی جو خدا کی مرضی کی چیز ہو اور جس پر چلنے کی وجہ سے خدا اپنے بندوں سے راضی ہوا ہو اور ان پر انعام کیا ہو۔ صراطِ مستقیم یہی ہے اس لیئے کہ جو شخص اس چیز کی توفیق دیا گیا جس کی توفیق اللہ کے نیک بندوںکو تھی جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا تھا اور جو نبی اور صدیق اور شہید اور صالح لوگ تھے وہ اسلام کی اور رسولوں کی تصدیق کی اور کتاب اللہ کو مضبوط تھام رکھنے کی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لانیکی اور اس کے منع کئے ہوئے کاموں سے رک جانیکی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے چاروں خلفاء اور تمام نیک بندوں کی راہ کی توفیق دیا گیا اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مؤمن کو تو خدا کی طرف سے ہدایت حاصل ہو چکی ہے پھر نماز اور غیر نماز میں ہدایت مانگنے کی کیا ضرورت؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اس سے ہدایت پر ثابت قدمی اور رسوخ اور بینائی اور ہمیشگی کی طلب ہے اسلیئے کہ بندہ ہر ساعت اور ہر حالت میں خداوند تبارک و تعالیٰ کا محتاج ہے وہ خود اپنی جان کے نفع نقصان کا مالک نہیں، بلکہ دن رات اپنے خدا کی طرف محتاج ہے اسی لیئے خدا نے اُسے سکھایا کہ ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرتا رہے اور ثابت قدمی اور توفیق چاہتا رہے۔ بھلا اور نیک بخت انسان وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے در کا بھکاری بنا لے وہ خدا پر پکارنے والے کی پکار کے قبول کرنے کا کفیل ہے بالخصوص بیقرار محتاج اور اسکی طرف اپنی حاجت دن رات پیش کرنیوالے کی ہر پکار کو قبول کرنیکا وہ ضامن ہے اور جگہ قرآن کریم میں ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ الخ ۔ اے ایمان والو اللہ پر اسکی رسولؐ پر اسکی اُس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول کی طرف نازل فرمائی اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئیں سب ایمان پر لاؤ اس آیت میں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا ایسا ہی ہے جیسا یہاں ہدایت والوں کو ہدایت کی طلب کا حکم دینا۔ مراد دونوں جگہ ثابت قدمی اور استمرار ہے اور ایسے اعمال پر ہمیشگی کرنی جو اس مقصد کے حاصل کرنے میں مدد پہنچائیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہو بھی نہیں سکتا کہ یہ حاصل شدہ چیز کا حاصل کرنا ہے واللہ اعلم۔ اور دیکھیئے اللہ رب العزت نے اپنے ایماندار بندوںکو حکم دیا ہے کہ وہ کہیں رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ یعنی اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد ٹیڑھا کر اور ہمیں اپنے پاس کی رحمت عطا فرما تو بہت بڑا دینے والا اور عطا فرمانیوالا ہے۔ یہ بھی وارد ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مغرب کی تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد اس آیت کو پست آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ کے معنی یہ ہوئے کہ خدایا ہمیں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ اور اس سے ہمیں نہ ہٹا۔

## صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا نہ راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ اُن لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے

اس کا بیان پہلے گذر چکا ہے کہ بندے کے اس قول پر خداوند کریم فرماتا ہے۔ یہ میرے بندے کیلئے ہے اور میرے بندے کیلئے جو کچھ وہ مانگے یہ آیت تفسیر ہے صراطِ مستقیم کی اور نحویوں کے نزدیک یہ اس سے بدل ہے اور عطف بیان بھی ہو سکتی ہے واللہ اعلم۔ اور جن پر خدا کا انعام ہوا ان کا بیان سورۂ نساء میں آچکا ہے فرمان ہے وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ الخ یعنی خدا اور رسول کے ماننے والے ان کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا کا انعام ہے جو نبی اور صدیق اور شہید اور صالح لوگ ہیں یہ بہترین ساتھی اور اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل خداوندی ہے اور خدا کا جاننے والا ہونا کافی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ خدا تو مجھے اُن فرشتوں، نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کی راہ چلا جن پر تو نے اپنی اطاعت و عبادت کی وجہ سے انعام نازل فرمایا یہ آیت ٹھیک وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ الخ کی طرح ہے۔ ربیع بن انس کہتے ہیں اس سے مراد انبیاء ہیں۔ ابن عباسؓ اور مجاہد فرماتے ہیں مومن ہیں وکیع کہتے ہیں مسلمان ہیں۔ عبدالرحمٰن فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ مراد ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے واللہ اعلم۔ جمہور کی قرأت میں غَيْرِ را کی زیر کیساتھ ہے اور صفت ہے۔ زمخشری کہتے ہیں را کی زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور حال ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر بن خطابؓ کی قرأت یہی ہے اور ابن کثیر سے بھی روایت کی گئی ہے۔ عَلَيْهِمْ میں جو ضمیر ہے وہ اس کا ذوالحال ہے اور اَنْعَمْتَ عامل ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ خدایا تو ہمیں سیدھا راستہ دکھا اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ جو ہدایت اور استقامت والے تھے اور خدا اور رسول کے اطاعت گذار اس کے حکموں پر عمل کرنیوالے اس کے منع کئے ہوئے کاموں سے رکنے والے تھے۔

اُن کی راہ سے بچا جن پر غضب و غصہ کیا گیا جن کے ارادے فاسد ہو گئے حق کو جانکر پھر اس سے ہٹ گئے اور گم گشتہ راہ لوگوں کے طریقے سے بھی ہمیں بچالے جو سرے سے علم ہی نہیں رکھتے مارے مارے پھرتے ہیں راہ سے بھٹکتے ہوئے حیران و سرگرداں ہیں اور راہ حق کی طرف رہنمائی نہیں کئے جاتے لا کو دوبارہ لا کر کلام کی تاکید کرنا اس لیے ہے کہ معلوم ہو جائے کہ یہاں دو غلط راستے ہیں۔ ایک یہود کا دوسرا نصاریٰ کا۔ بعض نحوی کہتے ہیں کہ غَيْر کا لفظ یہاں پر استثناء کیلئے ہے تو استثناء منقطع ہو سکتا ہے، کیونکہ جن پر انعام کیا گیا ہے اُن میں سے یہ استثناء ہوتا ہے اور یہ لوگ انعام والوں میں داخل ہی نہ تھے۔ لیکن ہم نے جو تفسیر کی ہے یہ بہت اچھی ہے عرب شاعروں کے شعر میں ایسا پایا جاتا ہے کہ وہ موصوف کو حذف کر دیتے ہیں اور صرف صفت بیان کر دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں بھی صفت کا بیان ہے اور موصوف محذوف ہے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ سے مراد غیر صراط المغضوب ہے۔ مضاف الیہ کے ذکر سے کفایت کی گئی ہے اور مضاف بیان نہ کیا گیا اس لئے کہ نشست الفاظ ہی اس پر دلالت کر رہی ہے۔ پہلے دو مرتبہ یہ لفظ آچکا ہے۔ بعض کہتے ہیں۔ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں لا زائد ہے اور ان کے نزدیک تقدیر کلام اس طرح ہے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْنَ ۝ اور اس کی شہادت عرب شاعروں کے شعر سے بھی ملتی ہے لیکن صحیح بات وہی ہے جو ہم پہلے لکھ چکے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَغَيْرِ الضَّآلِّيْنَ ۝ پڑھنا صحیح سند سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت اُبی بن کعبؓ سے بھی روایت ہے اور یہ محمول ہے اس پر کہ ان بزرگوں سے یہ بطور تفسیر صادر ہوا تو ہمارے قول کی تائید ہوئی کہ لا نفی کی تاکید کیلئے ہی لایا گیا ہے تاکہ یہ وہم ہی نہ ہو کہ یہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پر عطف ہے اور اس لئے بھی کہ دونوں راہوں کا فرق معلوم ہو جائے تاکہ ہر شخص ان دونوں سے بچتا رہے۔ اہل ایمان کا تو طریقہ یہ ہے کہ حق کا علم بھی ہو اور حق پر عمل بھی ہو۔ یہودیوں کے یہاں عمل نہیں اور نصاریٰ کے یہاں علم نہیں۔ اسی لئے یہودیوں پر غضب ہوا اور نصرانیوں کو گمراہی ملی۔ اسلئے کہ باوجود علم کے عمل کو چھوڑنا سبب ہے غضب کا۔ اور نصرانی گو ایک چیز کا قصد تو کرتے ہیں لیکن اس کے صحیح راستہ کو نہیں پا سکتے۔ اس لئے کہ ان کا طریقہ کار غلط ہے وہ اتباعِ حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔ یوں تو غضب اور گمراہی ان دونوں جماعتوں کے حصہ میں ہے۔ لیکن یہودی غضب کے

حصہ میں پیش پیش ہیں۔ جیساکہ اور جگہ قرآن کریم میں ہے مِنْهُمْ مَّنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ اور نصرانی ضلالت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ فرمانِ خداوندی ہے قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ یعنی یہ پہلے ہی سے گمراہ ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر بھی چکے ہیں اور سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اسکی تائید میں بہت سی احادیث و روایات پیش کی جاسکتی ہیں مسند احمد میں ہے کہ حضرت عدی بن حاتمؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر نے میری پھوپھی اور چند لوگوں کو گرفتار کرکے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تو میری پھوپھی نے کہا کہ میری خبر گیری کرنے والا دُور ہے اور میں عمر رسیدہ بڑھیا ہوں جو کسی خدمت کے لائق نہیں آپ مجھ پر احسان کیجئے اور مجھے رہائی دیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بھی احسان کریگا۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ تیری خبر لینے والا کون ہے؟ اس نے کہا عدی بن حاتم۔ آپؐ نے فرمایا وہی جو خدا اور رسولؐ سے بھاگتا پھرتا ہے؟ پھر آپ نے اسے آزاد کردیا۔ جب لوٹ کر آپؐ آئے تو آپکے ساتھ ایک شخص تھے اور غالباً وہ حضرت علیؓ تھے۔ آپ نے فرمایا لو ان سے سواری مانگ لو۔ میری پھوپھی نے ان سے درخواست کی جو منظور ہوئی۔ اور سواری مل گئی وہ یہاں سے آزاد ہوکر میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ حضورؐ کی سخاوت نے تو تیرے باپ حاتم کی سخاوت کو بھی ماند کردیا۔ آپکے پاس جو آتا ہے وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ یہ سن کر میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے دیکھا کہ چھوٹے بچے اور بوڑھی عورتیں بھی آپؐ کی خدمت میں آتی جاتی رہیں اور آپ ان سے بھی بے تکلفی کیساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ اس بات نے مجھے یقین دلایا کہ آپ قیصر و کسریٰ کی طرح بادشاہت اور وجاہت کے طلب کرنیوالے نہیں۔ آپؐ نے مجھے دیکھ کر فرمایا عدی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے سے کیوں بھاگتے ہو؟ کیا خدا کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق ہے؟ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہنے سے کیوں منہ موڑتے ہو؟ کیا اللہ عزوجل سے بھی بڑا کوئی ہے؟ (مجھ پر ان کلمات اور آپکی سادگی اور بے تکلفی نے ایسا اثر کیا) کہ میں فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ جس سے آپ بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے۔ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہودی ہیں اور ضَآلِّيْنَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عدیؓ کے سوال پر حضورؐ نے یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی۔ اس حدیث کی بہت سی سندیں ہیں اور مختلف الفاظ سے مروی ہے بنو قین کے ایک شخص نے وادی القریٰ میں حضورؐ سے یہی سوال کیا کہ آپؐ نے جواب میں یہی فرمایا۔ بعض روایتوں میں ان کا نام عبداللہ بن عمرو ہے واللہ اعلم۔ ابن مردویہ میں ابوذرؓ سے بھی یہی روایت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابن مسعودؓ اور بہت سے صحابیوں سے بھی یہ تفسیر منقول ہے۔ ربیع بن انس عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ وغیرہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ بلکہ ابن ابی حاتم تو فرماتے ہیں مفسرین میں اس بارے میں اختلاف ہی نہیں۔ ان ائمہ کی اس تفسیر کی دلیل ایک تو وہ حدیث ہے جو پہلے گذری۔ دوسری سورۂ بقرہ کی یہ آیت جس میں بنی اسرائیل کو خطاب کرکے کہا گیا ہے۔ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ الخ اس آیت میں ہے کہ اُن پر غضب پر غضب نازل ہوا اور سورۂ مائدہ کی آیت قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ الخ میں بھی ہے کہ ان پر غضب خداوندی نازل ہوا اور جگہ فرمان خداوندی ہے لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ یعنی بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی۔ داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبانی یہ بوجہ انکی نافرمانی اور حد سے گذر جانے کے ہے یہ لوگ کسی برائی کے کام سے آپس میں روک ٹوک نہیں کرتے تھے یقیناً ان کے کام بہت بُرے تھے اور تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل جبکہ دین خالص کی تلاش میں اپنے ساتھیوں سمیت نکلے اور ملکِ شام میں آئے تو ان سے یہودیوں نے کہا کہ آپ ہمارے دین میں داخل نہیں ہوسکتے جبتک غضبِ خداوندی کا ایک حصہ نہ لیں انہوں نے جواب دیا کہ اس سے بچنے کیلئے تو دین حق کی تلاش میں نکلے ہیں پھر اسے کیسے قبول کرلیں؟ نصرانیوں سے ملے انہوں نے کہا جبتک خداوند تعالیٰ کی ناراضگی کا حصہ نہ لیں تب تک آپ ہمارے دین میں نہیں آسکتے۔ انہوں نے کہا ہم یہ بھی نہیں کرسکتے۔ چنانچہ وہ اپنی فطرت پر ہی رہے بتوں کی عبادت اور قوم کا دین چھوڑ دیا۔ لیکن یہودیت یا نصرانیت اختیار نہ کی۔ البتہ زید کے ساتھیوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا اس لئے کہ یہودیوں کے مذہب سے یہ ملتا جلتا تھا۔ انہی میں حضرت ورقہ بن نوفل تھے۔ انھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ ملا اور ہدایت خداوندی نے انکی راہبری کی اور یہ حضورؐ پر ایمان لائے اور جو وحی اس وقت تک اتری تھی اس کی تصدیق کی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

**مسئلہ**۔ ضاد اور ظے کی قرأت میں بہت باریک فرق ہے اور ہر ایک کے بس کا نہیں اس لئے علمائے کرام کا صحیح مذہب یہ ہے کہ یہ فرق معاف ہے۔ ضاد کا صحیح مخرج تو یہ ہے کہ زبان کا اوّل کنارہ اور اس کے پاس کی ڈاڑھیں۔ اور ظے کا مخرج زبان کا ایک طرف اور سامنے والے اوپر کے دو دانت کے کنارے۔ دوسرے یہ کہ یہ دونوں حرف مجہورہ اور رخوہ اور مطبقہ ہیں۔ پس اُس شخص کو جسے ان دونوں میں تمیز کرنی مشکل معلوم ہو اُسے معاف ہے کہ ضاد کو ظے کی طرح پڑھ لے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ضاد کو سب سے صحیح پڑھنے والا میں ہوں، لیکن یہ حدیث بالکل بے اصل اور ضعیف ہے۔

**فصل** یہ مبارک سورت نہایت کارآمد مضامین کا مجموعہ ہے ان سات آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد اسکی بزرگی اسکی ثنا و صفت اور اس کے پاکیزہ ناموں کا اور اُس کی بلند و بالا صفتوں کا بیان ہے۔ ساتھ ہی قیامت کے دن کا ذکر ہے اور بندوں کو ارشاد ہے کہ وہ اس مالک سے سوال کریں اسکی طرف تضرع و زاری کریں اپنی مسکینی اور بیکسی کا اقرار کریں اور اُس کی عبادت خلوص کے ساتھ کریں اور اس کی توحید اُلوہیت کا اقرار کریں اور اسے شریک نظیر اور مثل سے پاک اور برتر جانیں۔ صراطِ مستقیم کی اور اس پر ثابت قدمی کی اس سے طلب کریں اور یہی ہدایت انھیں قیامت والے دن پل صراط سے بھی پار اُتارے گی اور نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحوں کے پڑوس میں جنت الفردوس میں جگہ دلوائیگی۔ ساتھ ہی اس سورت میں نیک اعمال کی ترغیب ہے تاکہ قیامت کے دن نیکوں کا ساتھ ملے۔ اور باطل راہوں پر چلنے سے ڈراوا ہے۔ تاکہ قیامت کے دن بھی اُن کی جماعتوں سے دوری ہو یہ باطل پرست یہود و نصاریٰ ہیں۔ اس باریک نکتہ پر بھی غور کیجئے کہ انعام کی اسناد تو اللہ تعالیٰ کیطرف کیگئی اور اَنْعَمْتَ کہا گیا اور غضب کی اسناد نہیں کیگئی۔ یہاں فاعل حذف کر دیا اور مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کہا گیا اس میں پروردگار عالم کی جناب میں ادب کیا گیا ہے۔ دراصل حقیقی فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسا اور جگہ ہے غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ اور اسی طرح ضلالت کی اسناد بھی انکی طرف کی گئی جو گمراہ ہیں۔ حالانکہ اور جگہ ہے مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ الخ یعنی خدا جسے راہ دکھائے وہ راہ یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کردے اس کا ولی اور مرشد کوئی نہیں اور جگہ فرمایا مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ الخ یعنی جسے اللہ گمراہ کردے اس کا ہادی کوئی نہیں وہ تو اپنی سرکشی میں بہکے رہتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ راہ دکھانیوالا اور گمراہ کرنیوالا صرف اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہی ہے قدریہ فرقہ جو اِدھر اُدھر کی متشابہ آیتوں کو دلیل بنا کر کہتا ہے کہ بندے خود مختار ہیں وہ خود پسند کرتے ہیں اور خود کرتے ہیں یہ غلط ہے۔ کھلی اور صاف صاف آیتیں اُن کی تردید میں موجود ہیں۔ لیکن باطل پرست فرقوں کا یہی قاعدہ ہے کہ صراحت کو چھوڑ کر متشابہ کے پیچھے لگا کرتے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جب تم اُن لوگوں کو دیکھو جو متشابہ آیتوں کے پیچھے لگتے ہیں تو سمجھ لو کہ انہی لوگوں کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے تم ان کو چھوڑ دو۔ حضورؐ کا اشارہ اس فرمان میں اس آیت شریف کی طرف ہے۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ الخ یعنی جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ کے پیچھے لگتے ہیں، فتنوں اور تاویل کو ڈھونڈنے کیلئے۔ پس الحمدللہ بدعتیوں کیلئے قرآن پاک میں صحیح دلیل کوئی نہیں۔ قرآن کریم تو حق و باطل ہدایت و ضلالت میں فرق کرنے کیلئے آیا ہے۔ اس میں تناقض اور اختلاف نہیں۔ یہ تو حکیم و حمید خدا کا نازل کردہ ہے۔

**فصل** سورۂ فاتحہ کو ختم کرکے آمین کہنا مستحب ہے۔ اٰمِيْنَ مثل یاسین کے اور اٰمِيْن بھی کہا گیا ہے اور اسکے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ تو قبول فرما۔ آمین کہنے کے مستحب ہونیکی دلیل وہ حدیث ہے جو مسند احمد، ابوداؤد اور ترمذی میں وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنا کہ آپ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہہ کر آمین کہتے تھے اور آواز دراز کرتے تھے۔ ابوداؤد میں ہے آواز بلند کرتے تھے۔ امام ترمذی اس حدیث کو حسن کہتے ہیں حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پہلی صف والے لوگ جو آپ کے قریب ہوتے سُن لیتے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں یہ حدیث ہے۔ ابن ماجہ میں یہ بھی ہے کہ آمین کی آواز سے مسجد گونج اُٹھتی تھی۔ دارقطنی میں بھی یہ حدیث ہے اور دارقطنی اسے حسن بتاتے ہیں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ مجھ سے پہلے آمین نہ کہیے (ابوداؤد) حسن بصری اور جعفر صادقؒ سے آمِیْنَ کہنا مروی ہے جیسا کہ آمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قرآن میں ہے ہمارے اصحاب وغیرہ کہتے ہیں جو نماز میں نہ ہو اسے بھی آمین کہنا چاہیے۔ ہاں جو نماز میں ہو اس پر تاکید زیادہ ہے نمازی خواہ اکیلا ہو خواہ مقتدی ہو خواہ امام ہو ہر حالت میں آمین کہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام آمین کہے تم بھی آمین کہو۔ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے ملجائے اسکے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، مسلم شریف میں ہے آنحضورؐ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنی نماز میں آمین کہتا ہے اور فرشتے آسمان میں آمین کہتے ہیں اور ایک کی آمین دوسرے کی آمین سے موافقت کر جاتی ہے تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اسکی آمین کا اور فرشتوں کی آمین کا وقت ایک ہی ہو جائے یا موافقت سے مراد قبولیت میں موافقت ہونا ہے یا اخلاص میں صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تم آمین کہو خدا قبول فرمائے گا۔ ابن عباسؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا آمین کے کیا معنی ہیں۔ آپ نے فرمایا اے اللہ تو کر جوہری کہتے ہیں اسکے معنی "اسی طرح ہو"۔ ترمذی کہتے ہیں اسکے معنی ہیں کہ ہماری امیدوں کو نہ توڑ۔ اکثر علماء فرماتے ہیں اس کے معنی "اے اللہ تو ہماری دعا قبول فرما" کے ہیں۔ مجاہد، جعفر صادق، ہلال بن یسافؒ فرماتے ہیں کہ آمین اللہ تعالیٰ کے ناموں میں۔ ایک نام ہے۔ ابن عباس سے مرفوعاً بھی یہ مروی ہے لیکن صحیح نہیں۔ امام مالک کے اصحاب کا مذہب ہے کہ امام نہ کہے مقتدی آمین کہیں کیونکہ مؤطا امام مالک کی حدیث میں ہے جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ اسی طرح ان کی دلیل کی تائید میں صحیح مسلم والی ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت بھی آتی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو لیکن بخاری و مسلم کی حدیث پہلے بیان ہو چکی۔ کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ولا الضالین پڑھکر آمین کہتے تھے۔ جہری نمازوں میں مقتدی اونچی آواز سے آمین کہے یا نہ کہے اس میں ہمارے ساتھیوں کا اختلاف ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر امام آمین کہنی بھول گیا ہو تو مقتدی باآواز بلند آمین کہیں۔ اگر امام نے خود اونچی آواز سے آمین کہی ہو تو نیا قول یہ ہے کہ مقتدی باآواز بلند نہ کہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے اور ایک روایت میں امام مالک سے مروی ہے اسلئے کہ نماز اور اذکار کی طرح یہ بھی ایک ذکر ہے تو نہ وہ بلند آواز سے پڑھے جاتے ہیں نہ یہ بلند آواز سے پڑھا جائے، لیکن اگلا قول یہ ہے کہ آمین بلند آواز سے بھی کہی جائے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مذہب ہے اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی دوسری روایت کے اعتبار سے یہی مذہب ہے اور اس کی دلیل وہی حدیث ہے جو پہلے بیان ہو چکی کہ آواز سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔ ہمارے یہاں پر ایک تیسرا قول بھی ہے کہ اگر مسجد چھوٹی ہو تو مقتدی باآواز بلند آمین نہ کہیں اس لئے کہ وہ امام کی قرأت سنتے ہیں اور اگر بڑی ہو تو اونچی آواز سے آمین کہیں تاکہ کونے کونے میں آمین پہنچ جائے۔ واللہ اعلم۔

مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہودیوں کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ہماری تین چیزوں پر یہودیوں کو اتنا بڑا حسد ہے کہ کسی اور چیز پر نہیں۔ ایک تو جمعہ کہ خدا نے ہمیں اسکی ہدایت کی اور یہ بہک گئے۔ دوسرے قبلہ تیسرے ہمارا امام کے پیچھے آمین کہنا۔ ابن ماجہ کی حدیث میں یوں ہے کہ یہودیوں کو سلام پر اور آمین پر جتنی چڑ ہے اتنی کسی اور چیز پر نہیں اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تمہارا جسقدر حسد یہودی آمین پر کرتے ہیں اس قدر حسد اور امر پر نہیں کرتے تم بھی آمین بکثرت کہا کرو۔ اسکی اسناد طلحہ بن عمرو راوی ضعیف ہیں۔ ابن مردویہ میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا آمین اللہ تعالیٰ کی مہر ہے اپنے مومن بندوں پر حضرت انسؓ والی حدیث میں ہے کہ نماز میں آمین کہنی اور دعا پر آمین کہنی خداوند تعالیٰ کی طرف سے مجھے عطا کی گئی ہے جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئی۔ ہاں اتنا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی خاص دعا پر حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے۔ تم اپنی دعاؤں کو آمین پر ختم کیا کرو اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے حق میں قبول فرمایا کریگا۔ اس حدیث کو پیش نظر رکھکر قرآن کریم کے ان الفاظ کو دیکھیے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ الخ ہے یعنی خدایا تو نے فرعون اور فرعونیوں کو دنیا کی زینت اور مال دنیا کی زندگانی میں عطا فرمایا ہے جس سے وہ تیری راہ سے دوسروں کو بہکاتے ہیں خدایا انکے مال برباد کر اور

ان کے دل سخت کر یہ نہ ایمان لائیں جبتک دردناک عذاب نہ دیکھہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کی قبولیت کا اعلان ان الفاظ میں ہوتا ہے قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا یعنی تم دونوں کی دعا قبول کی گئی تم مضبوط رہو اور بے علموں کی راہ نہ جاؤ۔ دعا صرف حضرت موسیٰ کرتے تھے اور حضرت ہارونؑ صرف آمین کہتے تھے لیکن قرآن نے دعا کی نسبت دونوں کی طرف کی۔ اس سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ جو شخص کسی دعا پر آمین کہے اس نے گویا خود وہ دعا کی۔ اب اس استدلال کو سامنے رکھ کر پھر وہ قیاس کرتے ہیں کہ مقتدی قرأت نہ کرے اس لئے کہ اس کا سورۂ فاتحہ پر آمین کہنا قائم مقام پڑھنے کے ہے اور اس حدیث کو بھی دلیل میں لاتے ہیں کہ جسکا امام ہو تو امام کی قرأت اسکی قرأت ہے (مسند احمد)، حضرت بلالؓ کہا کرتے تھے کہ حضورؐ آمین میں مجھ سے سبقت نہ کیا کیجئے۔ اس کھینچا تانی سے مقتدی پر جہری نمازوں میں الحمد کا نہ پڑھنا ثابت کرنا چاہتے ہیں واللہ اعلم (یہ یاد رہے کہ اسکی مفصل بحث پہلے گذر چکی ہے)، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب امام غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝ کہہ کر آمین کہتا ہے اور آسمان والوں کی آمین زمین والوں کی آمین سے ملجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بندے کے تمام پچھلے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ آمین نہ کہنے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک قوم کیساتھ ملکر غزوہ کیا غالب آئے مال غنیمت جمع کیا اب قرعہ ڈالکر حصہ لینے لگے تو اس شخص کے نام کا قرعہ نکلا ہی نہیں اور کوئی حصہ نہ ملا اس نے کہا یہ کیوں؟ تو جواب ملا کہ تیرے آمین نہ کہنے کی وجہ سے۔

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبِّ یَسِّرْ وَاَعِنْ یَا کَرِیْمُ

# سورہ بقرہ کی تفسیر اس مبارک سورت کے فضائل کا بیان

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سورۂ بقرہ قرآن کی کوہان اور اسکی بلندی ہے۔ اسکی ایک ایک آیت کیساتھ اسّی فرشتے نازل ہوتے تھے اور بالخصوص آیت الکرسی تو خاص عرش سے نازل ہوئی اور اس سورت کیساتھ ملائی گئی۔ سورۂ یٰسٓ قرآن کا دل ہے۔ جو شخص اسے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور آخرت طلبی کیلئے پڑھے اُسے بخشدیا جاتا ہے۔ اس سورت کو مرنیوالوں کے سامنے پڑھا کرو (مسند احمد) اس حدیث کی سند میں ایک جگہ عَنْ رَجُلٍ ہے جس سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس سے مراد کون ہیں لیکن مسند احمد ہی کی دوسری روایت میں انکا نام ابو عثمان آگیا ہے۔ یہ حدیث اسی طرح ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔ ترمذی کی ایک ضعیف سند والی حدیث میں ہے کہ ہر چیز کی ایک بلندی ہوتی ہے اور قرآن پاک کی بلندی سورۂ بقرہ ہے۔ اس سورت میں ایک آیت ہے جو تمام آیتوں کی سردار ہے اور وہ آیۃ الکرسی ہے۔ مسند احمد۔ صحیح مسلم، ترمذی اور نسائی میں حدیث ہے کہ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے وہاں شیطان داخل نہیں ہو سکتا۔ امام ترمذیؒ اسے حسن صحیح بتلاتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اس حدیث میں ایک راوی کو امام یحییٰ بن معین تو ثقہ بتلاتے ہیں لیکن امام احمد وغیرہ انکی حدیث کو منکر کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے اسے نسائی نے الیوم واللیلہ میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور اسکی سند کو صحیح کہا ہے۔ ابن مردویہ میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میں تم میں سے کسی کو ایسا نہ پاؤں کہ وہ پیر پہ پیر چڑھائے پڑھتا چلا جائے لیکن سورہ بقرہ نہ پڑھے۔ سنو! جس گھر میں یہ مبارک سورت پڑھی جاتی ہے وہاں سے شیطان بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ سب گھروں میں بدترین اور ذلیل تر گھر وہ ہے جس میں کتاب اللہ کی تلاوت نہ کیجائے امام نسائی نے الیوم واللیلہ میں بھی اسے بیان کیا ہے۔ مسند دارمی میں حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے اس گھر سے شیطان گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔ ہر چیز کی اونچائی ہوتی ہے اور قرآن کی اونچائی سورۂ بقرہ ہے ہر چیز کا مغز ہوتا ہے اور قرآن کا

منز مفصل کی سورتیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی چار پہلی آیتیں اور آیۃ الکرسی اور دو آیتیں اسکے بعد کی اور تین آیتیں سب سے آخر کی یہ جملہ دس آیتیں رات کے وقت پڑھ لے اس گھر میں شیطان اس رات نہیں جا سکتا۔ اور اسے اسکے گھر والوں کو اس دن شیطان یا کوئی اور بری چیز ستا نہیں سکتی۔ یہ آیتیں مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کا دیوانہ پن بھی دور ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جس طرح ہر چیز کی بلندی ہوتی ہے۔ قرآن کی بلندی سورۂ بقرہ ہے۔ جو شخص رات کے وقت اسے اپنے گھر میں پڑھے تین راتوں تک شیطان اُس گھر میں نہیں جا سکتا۔ اور دن کو اگر گھر میں پڑھ لے تو تین دن تک شیطان اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا (طبرانی، ابن حبان و ابن مردویہ)۔ ترمذی نسائی اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضورؐ نے ایک چھوٹا سا لشکر ایک جگہ بھیجا اور اس کی سرداری آپؐ نے انہیں دی جنہوں نے فرمایا تھا کہ مجھے سورۂ بقرہ یاد ہے۔ اس وقت ایک شریف شخص نے کہا میں بھی اسے یاد کر لیتا، لیکن مجھے ڈر لگا کہ ایسا نہ ہو میں اس پر عمل نہ کر سکوں۔ حضورؐ نے فرمایا قرآن سیکھو قرآن کو پڑھو جو شخص اسے سیکھتا ہے پڑھتا ہے پھر اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بھرا ہوا برتن جس کی خوشبو ہر طرف مہک رہی ہے۔ اسے سیکھے ہوئے سو جانیوالے کی مثال اس برتن کی سی ہے جس میں مشک تو بھری ہوئی ہے لیکن اُوپر سے منہ بند کر دیا گیا ہے۔ امام ترمذی اسے حسن کہتے ہیں اور مرسل روایت بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ رات کو سورۂ بقرہ کی تلاوت شروع کی۔ انکا گھوڑا جو ان کے پاس ہی بندھا ہوا تھا اس نے بدکنا شروع کیا۔ آپ نے قرأت چھوڑ دی گھوڑا بھی سیدھا ہو گیا۔ آپنے پھر پڑھنا شروع کیا گھوڑے نے بھی پھر بدکنا شروع کیا۔ آپنے پھر پڑھنا موقوف کیا گھوڑا بھی ٹھیک ٹھاک ہو گیا تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ چونکہ انکے صاحبزادے یحییٰ گھوڑے کے پاس ہی لیٹے ہوئے تھے اسلئے ڈر معلوم ہوا کہ کہیں بچے کو چوٹ نہ آ جائے قرآن کا پڑھنا بند کر کے اُسے اٹھا لیا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھا کہ گھوڑے کے چمکنے کی کیا وجہ ہے؟ صبح حضورؐ کی خدمت میں آ کر واقعہ بیان کرنے لگے۔ آپؐ سنتے جاتے ہیں اور فرماتے جاتے ہیں اُسید پڑھتے چلے جاؤ۔ حضرت اُسیدؓ نے کہا حضور تیسری مرتبہ کے بعد تو یحییٰ کیوجہ سے میں نے پڑھنا بالکل بند کر دیا۔ اب جو نگاہ اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی چیز ابر کی طرح سایہ فگن ہے اور اس میں چراغوں کی سی روشنی ہے۔ بس میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُوپر کو اٹھ گئی۔ آپنے فرمایا جانتے ہو یہ کیا چیز تھی؟ یہ فرشتے تھے جو تمہاری آواز کو سنکر قریب آ گئے تھے اگر تم پڑھنا موقوف نہ کرتے تو وہ صبح تک یونہی رہتے اور ہر شخص انہیں دیکھ لیتا، کسی سے نہ چھپتے۔ یہ حدیث کئی کتابوں میں مختلف سندوں کیساتھ موجود ہے۔ واللہ اعلم۔ اسکے قریب قریب واقعہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ گذشتہ رات ہم نے دیکھا کہ رات بھر حضرت ثابتؓ کا گھر نور کا بقعہ بنا رہا اور چمکدار روشن چراغوں سے جگمگاتا رہا۔ حضورؐ نے فرمایا شاید انہوں نے رات کو سورۂ بقرہ پڑھی ہوگی۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا سچ ہے رات کو میں سورۂ بقرہ کی تلاوت میں مشغول تھا۔ اسکی اسناد تو بہت عمدہ ہے مگر اسمیں ابہام ہے اور یہ مرسل بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

## سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی فضیلت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سورۂ بقرہ سیکھو اسکا سیکھنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے۔ جادوگر اسکی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد فرمایا سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران سیکھو یہ دونوں نورانی سورتیں ہیں اپنے پڑھنے والے پر سائبان یا بادل یا پرندوں کے جھنڈ کی طرح قیامت کے روز سایہ کرینگی، قرآن پڑھنے والا جب قبر سے اُٹھیگا تو دیکھے گا کہ ایک نوجوان نورانی چہرے والا شخص اس کے پاس کھڑا ہوا کہتا ہے کہ کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ یہ کہیگا نہیں، تو وہ جواب دے گا کہ میں قرآن ہوں جس نے دنوں کو تجھے بھوکا پیاسا رکھا تھا اور راتوں کو بستر سے دُور بیدار رکھا تھا۔ ہر تاجر اپنی تجارت کے پیچھے ہے لیکن آج سب تجارتیں تیرے پیچھے ہیں اب اسے ملک داہنے ہاتھ میں دیا جائیگا اور ہمیشگی بائیں ہاتھ میں اسکے سر پر وقار و عزت کا تاج رکھا جائیگا۔ اسکے ماں باپ کو دو ایسے عمدہ قیمتی حلے جائینگے کہ ساری دنیا بھی اسکی قیمت کے سامنے ہیچ ہو، وہ حیران ہو کر کہینگے کہ آخر اس رحم و کرم کی، اس انعام و اکرام کی کیا وجہ ہے؟ تو انہیں جواب دیا جائیگا

تمہارے بچے کی قرآن خوانی کی وجہ سے تم پر یہ نعمت انعام کی گئی۔ پھر اس سے کہا جائیگا پڑھتا جا اور جنت کے درجات پر چڑھتا جا۔ چنانچہ وہ پڑھتا جائیگا اور اعلیٰ سے اعلیٰ طبقے پر چڑھتا جائیگا خواہ ترتیل سے پڑھے خواہ بے ترتیل کے۔ ابن ماجہ میں بھی اس حدیث کا بعض حصہ مروی ہے اسکی اسناد حسن ہے اور شرط مسلم پر ہے۔ اس کے راوی بشیر بن مہاجر سے امام مسلم بھی روایت لیتے ہیں اور امام ابن معین اسے ثقہ کہتے ہیں۔ نسائی کا قول ہے کہ اسمیں کوئی حرج نہیں۔ ہاں امام احمد اسے منکر الحدیث بتلاتے ہیں اور فرماتے ہیں میں نے تلاش کی تو دیکھا کہ وہ عجیب عجیب حدیثیں لاتے ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں اسکی بعض حدیثوں کا خلاف کیا جاتا ہے۔ ابوحاتم رازی کا فیصلہ ہے کہ اسکی حدیثیں لکھی جاتی ہیں لیکن دلیل نہیں بنائی جاسکتیں، ابن عدی کا قول ہے کہ ان کی ایسی روایتیں بھی ہیں جن کی متابعت نہیں کیجاتی۔ دار قطنیؒ فرماتے ہیں یہ قوی نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی اس روایت کے بعض مضامین دوسری سندوں میں بھی آئے ہیں۔ مسند احمد میں ہے۔ قرآن پڑھا کرو یہ اپنے پڑھنے والوں کی قیامت کے دن شفاعت کریگا۔ دو نورانی سورتوں بقرہ اور آل عمران کو پڑھتے رہا کرو۔ یہ دونوں قیامت کے دن اس طرح آئینگی کہ گویا دو سائبان ہیں یا دو ابر ہیں یا پرکھولے پرندوں کی دو جماعتیں ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے خدائے تعالیٰ سے سفارش کرینگی۔ پھر حضورؐ نے فرمایا سورۂ بقرہ پڑھا کرو۔ اس کا پڑھنا برکت ہے اور چھوڑنا حسرت ہے۔ اسکی طاقت باطل والوں کو نہیں۔ صحیح مسلم شریف میں بھی حدیث ہے۔ مسند احمد کی ایک اور حدیث میں ہے قرآن اور قرآن پڑھنے والوں کو قیامت کے دن بلوایا جائے گا آگے آگے سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران ہوں گی، بادل کی طرح یا سائے اور سائبان کی طرح یا پرکھولے پرندوں کے جھرمٹ کی طرح یہ دونوں پروردگار سے ڈٹ کر سفارش کریں گی۔ مسلم اور ترمذی میں بھی یہ حدیث ہے۔ امام ترمذی اسے حسن غریب کہتے ہیں۔ ایک شخص نے اپنی نماز میں سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھی اسکے فارغ ہونے کے بعد حضرت کعبؓ نے فرمایا' خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ان میں خدا کا وہ نام ہے کہ اس نام کے ساتھ جب کبھی اسے پکارا جائے وہ قبول فرماتا ہے۔ اب اس شخص نے حضرت کعبؓ سے عرض کی کہ مجھے بتلائیے وہ نام کونسا ہے؟ حضرت کعبؓ نے اس سے انکار کیا اور فرمایا اگر میں بتا دوں تو خوف ہے کہ کہیں تو اس نام کی برکت سے ایسی دعا نہ مانگ لے جو میری اور تیری ہلاکت کا سبب بن جائے۔ حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں تمہارے بھائی کو خواب میں دکھلایا گیا کہ گویا لوگ ایک بلند و بالا پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر دو سرسبز درخت ہیں اور ان میں سے آوازیں آرہی ہیں کہ کیا تم میں کوئی سورۂ بقرہ کا پڑھنے والا ہے؟ کیا تم میں کوئی سورۂ آلِ عمران کا پڑھنے والا ہے؟ جب کوئی کہتا کہ ہاں تو وہ دونوں درخت اپنے پھلوں سمیت اس کی طرف جھک آتے اور یہ اسکی شاخوں پر بیٹھ جاتا اور وہ اسے اوپر اٹھا لیتے۔ حضرت ام درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک قرآن پڑھے ہوئے شخص نے اپنے پڑوسی کو مار ڈالا پھر قصاص میں وہ بھی مارا گیا۔ پھر قرآن کریم ایک ایک سورت ہو کر الگ ہونا شروع ہوا یہاں تک کہ اسکے پاس سورۂ آلِ عمران اور سورۂ بقرہ رہ گئیں۔ ایک جمعہ کے بعد سورۂ آلِ عمران بھی چلی گئی پھر ایک جمعہ اور گذرا تو آواز آئی کہ میری باتیں نہیں بدلا کرتیں اور میں اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ مبارک سورت یعنی سورۂ بقرہ بھی اس کے آگے ہو گئی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں اس کی طرف سے بلاؤں اور عذابوں کی آڑ بنی رہیں اور اس قبر میں اسکی دلجوئی کرتی رہیں اور سب سے آخر بوجہ اس کے گناہوں کی زیادتی کے ان کی سفارش بھی نہ چلی۔ یزید بن اسود جرشی کہتے ہیں کہ ان دونوں سورتوں کو دن میں پڑھنے والا دن بھر نفاق سے بری رہتا ہے اور رات کو پڑھنے والا ساری رات نفاق سے بری رہتا ہے۔ خود حضرت یزیدؒ اپنے معمولی وظیفہ' قرآن کے علاوہ ان دونوں سورتوں کو ہر صبح و شام پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جو شخص ان دونوں سورتوں کو رات کو پڑھتا رہے گا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ فرمانبرداروں میں شمار ہوگا۔ اس کی سند منقطع ہے صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سورتوں کو ایک رکعت میں پڑھا۔

## سات لمبی سورتوں کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے لمبی سورتیں توریت کی جگہ دی گئی ہیں اور انجیل کی جگہ مجھکو دو سو آیتوں والی سورتیں ملی ہیں اور زبور کے قائم مقام میں دو سو سے کم آیتوں والی سورتیں دیا گیا ہوں اور پھر مجھے فضیلت میں خاصۃً سورۂ قٓ سے لیکر آخر تک کی سورتیں ملی ہیں۔ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی سعید بن ابوبشیر

میں کچھ کلام ہے۔ ابوعبید نے اسے دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ ایک اور حدیث میں ہے جو شخص ان سات سورتوں کو حاصل کرے وہ بہت بڑا عالم ہے۔ یہ روایت بھی غریب ہے۔ مسند احمد میں بھی یہ روایت ہے، ایک مرتبہ حضورؐ نے ایک لشکر بھیجا اور اس کا امیر انھیں بنایا جنھیں سورۂ بقرہ یاد تھی حالانکہ وہ ان سب سے چھوٹی عمر کے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر تو وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ کی تفسیر میں بھی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہی سات سورتیں ہیں سورۂ بقرہ۔ سورۂ آل عمران، سورہ نساء۔ سورۂ مائدہ۔ سورہ انعام۔ سورۂ اعراف۔ اور سورۂ یونس۔ حضرت مجاہد مکحول عطیہ بن قیس ابومحمد فارسی شداد بن اوس یحییٰ بن حارث ذماری سے بھی یہی منقول ہے۔

**فصل** سورہ بقرہ ساری کی ساری مدینہ شریف میں نازل ہوئی ہے اور شروع شروع میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے، البتہ اسکی ایک آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ الخ یہ سب سے آخر نازل شدہ بتلائی جاتی ہے یعنی قرآن کریم میں سب سے آخری یہ آیت نازل ہوئی ہے ممکن ہے کہ نازل بعد میں ہوئی ہو لیکن ہے اسی میں سے اور اسی طرح سود کی حرمت کی آیتیں بھی آخر آخر نازل ہوئی ہیں۔ حضرت خالد بن معدان سورہ بقرہ کو فسطاط القرآن یعنی قرآن کا خیمہ کہا کرتے تھے۔ بعض علماء کا فرمان ہے کہ اس میں ایک ہزار خبریں ہیں اور ایک ہزار حکم ہیں، اور ایک ہزار کاموں سے ممانعت ہے۔ اس کی آیتیں دو سو ستائیس ۲۲۷ ہیں، اسکے کلمات چھ ہزار دو سو اکیس ۶۲۲۱ ہیں۔ اسکے حروف ساڑھے پچیس ہزار ۲۵۵۰۰ ہیں۔ واللہ اعلم۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ سورت مدنی ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ وغیرہ اور بہت سے ائمہ علماء اور مفسرین سے بھی بلا خلاف یہی مروی ہے۔ ابن مردویہ کی ایک حدیث میں ہے کہ سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران سورۃ النساء وغیرہ نہ کہا کرو بلکہ یوں کہو کہ وہ سورت جس میں بقرہ کا ذکر ہے۔ وہ سورت جس میں آل عمران کا بیان ہے اور اسی طرح قرآن کی سب سورتوں کا نام لیا کرو۔ لیکن یہ حدیث غریب ہے، بلکہ اس کا فرمانِ رسول ہونا ہی صحیح نہیں اسکے راوی عیسیٰ بن میمون ابوسلمہ خواص ضعیف ہیں ان کی روایت سے سند نہیں لی جاسکتی۔ اس کے خلاف صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے بطن وادی سے شیطان پر کنکریاں پھینکے۔ بیت اللہ ان کی بائیں جانب تھا اور منیٰ دائیں طرف اور فرمایا اسی جگہ سے کنکر پھینکتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن پر سورہ بقرہ اتری ہے۔ گو اس حدیث سے صاف ثابت ہوگیا کہ سورۂ بقرہ وغیرہ کہنا جائز ہے لیکن مزید سنئے ابن مردویہ میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں کچھ سستی دیکھی تو انھیں يَا اَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ کہہ کر پکارا۔ غالباً یہ حنین والے دن کا ذکر ہے۔ جب لشکر کے قدم اکھڑ گئے تھے تو حضورؐ کے حکم سے حضرت عباسؓ نے اے درخت والو یعنی اے بیعت الرضوان کرنیوالو۔ اور اے سورۂ بقرہ والو کہہ کر پکارا تھا تاکہ انھیں خوشی اور دلیری پیدا ہو چنانچہ اس آواز کے ساتھ ہی صحابہؓ ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ مسیلمہ جس نے نبوت کا جھوٹا دعوی کیا تھا اس کے ساتھ لڑنے کے وقت بھی جب قبیلۂ بنو حنیفہ کی چیرہ دستیوں نے پریشان کردیا اور قدم ڈگمگا گئے۔ صحابہؓ اسی طرح لوگوں کو يَا اَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ یعنی اے سورۂ بقرہ والو کہکر پکارا اور اس آواز پر سب کے سب جمع ہوگئے اور جم کر لڑے یہاں تک کہ ان مرتدوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لشکر کو فتح دی اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کے سب صحابہؓ سے خوش ہوئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

## الٓمٓ ①

الٓمٓ جیسے حروف مقطعہ۔ جو سورتوں کے اول میں آئے ہیں ان کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے معنی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں کسی اور کو معلوم نہیں اسلئے وہ ان حروف کی تفسیر نہیں کرتے۔ قرطبی نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے یہی نقل کیا ہے۔ عامر شعبی، سفیان ثوری، ربیع بن خثیم رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں ابو حاتم بن حبان بھی اسی کو پسند کرتے ہیں اور بعض لوگ ان حروف کی تفسیر بھی کرتے ہیں لیکن ان کی تفسیر میں بہت کچھ اختلاف ہے عبدالرحمن بن

زید بن اسلم فرماتے ہیں' یہ سورتوں کے نام ہیں۔ علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں اکثر لوگوں کا اسی پر اتفاق ہے سیبویہ نے بھی یہی کہا ہے اور اسکی دلیل صحیحین کی وہ حدیث ہے جسمیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن صبح کی نماز میں الٓمٓ السجدہ اور هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ پڑھتے تھے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ الٓمٓ اور حٰمٓ اور الٓمٓصٓ اور صٓ یہ سب سورتوں کی ابتداء ہے جن سے یہ سورتیں شروع ہوتی ہیں انہی سے یہ بھی منقول ہے کہ الٓمٓ قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ حضرت قتادہ اور حضرت زید بن اسلم کا بھی یہی قول ہے اور شاید اس قول کا مطلب بھی وہی ہے جو حضرت عبدالرحمٰن ابن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں کہ یہ سورتوں کے نام ہیں۔ اسلئے کہ ہر سورت کو قرآن کہہ سکتے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ سارے قرآن کا نام الٓمٓصٓ ہو۔ کیونکہ جب کوئی شخص کہے کہ میں نے سورۃ الٓمٓصٓ ۰ پڑھی تو ظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے سورۃ اعراف پڑھی نہ کہ پورا قرآن۔ واللہ اعلم بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ حضرت شعبی سالم بن عبداللہ اسماعیل بن عبدالرحمٰن سدی کبیر یہی کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ الٓمٓ اللہ تعالیٰ کا بڑا نام ہے۔ اور روایت میں ہے کہ حٰمٓ طٰسٓ اور الٓمٓ یہ سب اللہ تعالیٰ کے بڑے نام ہیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں سے یہ مروی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ اللہ کی قسم ہے اور اس کا نام بھی ہے۔ حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں یہ قسم ہے۔ ابن عباسؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کے معنی اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ۔ یعنی میں ہوں اللہ زیادہ جاننے والا حضرت سعید بن جبیر سے بھی یہ مروی ہے۔ ابن عباس ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کے الگ الگ حروف ہیں۔ ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ حروف الف اور لام اور میم انتیس ۲۹ حرفوں میں سے ہیں جو تمام زبانوں میں آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ہر حرف اللہ تعالیٰ کے ایک ایک نام کے شروع کا حرف ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی بلا کا ہے اور اس میں قوموں کی مدت اور اس کے وقت کا بیان ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعجب کرنے پر کہا گیا تھا کہ وہ لوگ کیسے کفر کریں گے اس کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ اسکے دیئے ہوئے رزق پر وہ پلتے ہیں۔ الف سے خدا کا نام اللہ شروع ہوتا ہے اور لام سے اس کا نام لطیف شروع ہوتا ہے اور میم سے اس کا نام مجید شروع ہوتا ہے اور الف سے مراد آلآء یعنی نعمتیں ہیں اور لام سے مراد اللہ تعالیٰ کا لطف ہے اور میم سے مراد اللہ تعالیٰ کا مجد یعنی بزرگی ہے۔ الف سے مراد ایک سال ہے اور لام سے تیس سال ہے اور میم سے چالیس سال (ابن ابی حاتم) ابن جریر نے ان سب مختلف اقوال میں تطبیق دی ہے۔ یعنی ثابت کیا ہے کہ ان میں ایسا اختلاف نہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سورتوں کے نام بھی ہوں اور اللہ تعالیٰ کے نام بھی ہوں اور سورتوں کے شروع کے الفاظ بھی ہوں۔ اور ان میں ہر ہر حرف سے خدائے تعالیٰ کے ایک ایک نام کی طرف اشارہ بھی ہو اور اسکی صفتوں کی طرف بھی اور مدت وغیرہ کی طرف بھی ایک ایک لفظ کئی کئی معنی میں آتا ہے جیسے لفظ اُمَّةٌ کہ اس کے ایک معنی ہیں۔ دین۔ جیسے قرآن میں ہے اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ یعنی ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی دین پر پایا۔ دوسرے معنی ہیں۔ خدا کا اطاعت گذار بندہ۔ جیسے فرمایا اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار اور مخلص بندے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے تیسرے معنی ہیں جماعت جیسے فرمایا وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً الخ یعنی ایک جماعت کو اس کنوئیں پر پانی پلاتے ہوئے پایا۔ اور جگہ ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا یعنے ہم نے ہر جماعت میں رسول بھیجا۔ چوتھے معنی ہیں مدت اور زمانہ۔ فرمان ہے وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ یعنی مدت کے بعد اسے یاد آیا۔ پس جس طرح یہاں لفظ کے کئی معنی ہوئے اسی طرح ممکن ہے کہ ان حروف مقطعہ کے بھی کئی معنی ہوں۔ امام ابن جریر کی اس تحقیق پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابوالعالیہ نے جو تفسیر کی ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ ایک لفظ ایک ساتھ ایک ہی جگہ ان سب معنی میں ہے اور لفظ امت وغیرہ جو کئی کئی معنی میں آتے ہیں جنھیں اصطلاح میں الفاظ مشترک کہتے ہیں ان کے معنی ہر جگہ جداجدا تو ضرور ہوتے ہیں لیکن ہر جگہ ایک ہی معنی ہوتے ہیں جو عبارت کے قرینے سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی جگہ سب کے سب معنی مراد نہیں ہوتے اور سب پر ایک جگہ محمول کرنے کے بارے میں علماء اصول کا بڑا اختلاف ہے اور ہمارے تفسیری موضوع سے اس کا بیان خارج ہے۔ واللہ اعلم۔ دوسرے یہ کہ امت وغیرہ الفاظ کے معنی ہیں تو بہت سارے اور یہ الفاظ اسی لئے بنائے گئے ہیں اور بندش کلام اور نشست الفاظ سے ایک معنی ٹھیک بیٹھ جاتے ہیں لیکن ایک حرف کی دلالت ایک ایسے نام پر کہ ممکن ہے کہ

وہ دوسرے ایسے نام پر بھی دلالت کرتا ہو اور ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہ ہو نہ تو مقدر ماننے سے نہ ضمیر دینے سے نہ وضع کے اعتبار سے اور نہ اور اعتبار سے تو ایسی بات علمی طور پر نہیں سمجھی جا سکتی۔ البتہ اگر منقول ہو تو اور بات ہے لیکن یہاں اختلاف ہے اور اجماع نہیں۔ اسلئے یہ فیصلہ قابل غور ہے، اب بعض عربی اشعار جو اس بات کی دلیل میں پیش کئے جاتے ہیں کہ کلمہ کو بیان کرنے کیلئے صرف اُس کا پہلا حرف بول دیتے ہیں یہ ٹھیک ہے لیکن ان اشعار میں خود عبارت ایسی ہوتی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے۔ ایک حرف کے بولتے ہی پورا کلمہ سمجھ میں آجاتا ہے لیکن یہاں ایسا بھی نہیں۔ واللہ اعلم۔ قرطبی کہتے ہیں ایک حدیث میں ہے کہ جو مسلمان کے قتل پر آدھے سے بھی مدد کرے مطلب یہ ہے کہ پورا نہ کہے بلکہ صرف اُقْ کہے مجاہد کہتے ہیں سورتوں کے شروع میں جو یہ حرف ہیں۔ مثلاً قٓ صٓ حٰمٓ طٰسٓمٓ الٓرٰ وغیرہ یہ سب حروف ہجا ہیں۔ بعض عربی داں کہتے ہیں کہ یہ حروف الگ الگ جو اٹھائیس ہیں ان میں سے چند ذکر کرکے باقی چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ میرا بیٹا اَ بَ تَ، ثَ لکھتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تمام اٹھائیس حرف لکھتا ہے لیکن ابتدا کے چند حروف ذکر کر دیئے باقی کو چھوڑ دیا سورتوں کے شروع میں اس طرح کے کل چودہ حروف آئے ہیں ا[۱] ل[۲] م[۳] ص[۴] ر[۵] ک[۶] ہ[۷] ی[۸] ع[۹] ط[۱۰] س[۱۱] ح[۱۲] ق[۱۳] ن[۱۴] ان سب کو اگر ملا لیا جائے تو یہ عبارت بنتی ہے نَصٌّ حَكِيمٌ قَاطِعٌ لَّهٗ سِرٌّ تعداد کے لحاظ سے یہ حرف چودہ ہیں اور جملہ حروف چونکہ اٹھائیس[۲۸] ہیں اسلئے یہ پورے آدھے ہوئے جو حروف بیان کئے گئے یہ ان حروف سے جو نہیں لائے گئے زیادہ فضیلت والے ہیں اور یہ صناعت تصریف ہے۔ ایک حکمت اس میں یہ بھی ہے کہ جتنی قسم کے حرف تھے اتنی قسمیں باعتبار اکثریت کے ان میں آگئیں یعنی مہموسہ مجہورہ وغیرہ سبحان اللہ ہر چیز میں اس مالک کی ایک شان نظر آتی ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ خدا کا کلام لغو اور بیہودہ اور بیکار اور بے معنی الفاظ سے پاک ہے جو جاہل لوگ کہتے ہیں کہ سرے سے ان حروف کے کچھ معنی ہی نہیں وہ بالکل خطا پر ہیں۔ اس کے کچھ نہ کچھ معنی یقیناً ہیں۔ اگر نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنی کچھ ثابت ہوں تو ہم وہ معنی کریں گے اور سمجھیں گے ورنہ جہاں حضورؐ نے کچھ معنی بیان نہیں کئے ہم بھی نہ کریں گے اور ایمان لائیں گے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ حضورؐ نے اس بارے میں کوئی تصریح نہیں فرمائی ہے اور علماء کا اس میں بیحد اختلاف ہے۔ اگر کسی قول کی دلیل معلوم ہو جائے تو خیر وہ اسے مان لے ورنہ بہتر یہ کہ ان حروف کے کلام خدا ہونے پر ایمان لائے اور یہ جانے کہ اس کے معنی ضرور ہیں جو خدا ہی کو معلوم ہیں اور ہم پر ظاہر نہیں ہوئے دوسری حکمت ان حروف کے لانے میں یہ بھی ہے کہ ان سے سورتوں کی ابتدا معلوم ہو جائے لیکن یہ وجہ ضعیف ہے اسلئے کہ اس کے بغیر ہی سورتوں کی جدائی معلوم ہو جاتی ہے۔ جن سورتوں میں ایسے حروف ہی نہیں کیا ان کی ابتدا انتہا معلوم نہیں؟ پھر سورتوں سے پہلے بسم اللہ الخ کا پڑھنے اور لکھنے کے اعتبار سے موجود ہونا کیا ایک سورت کو دوسری سے جدا نہیں کرتا؟ امام ابن جریر نے اس کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی ہے کہ چونکہ مشرکین کتاب اللہ کو سنتے ہی نہ تھے اس لئے انہیں سنانے کیلئے ایسے حروف لائے گئے تاکہ جب انکے کان لگ جائیں کہ باقاعدہ تلاوت شروع ہو لیکن یہ وجہ بھی کمزور ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو تمام سورتوں کی ابتداء انہی حروف سے کی جاتی، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ اکثر سورتیں اس سے خالی ہیں۔ پھر جب کبھی مشرکین سے کلام شروع ہو یہی حروف چاہئیں نہ کہ صرف سورتوں کے شروع میں ہی یہ حروف ہوں۔ پھر اس پر بھی غور کر لیجئے کہ یہ سورت یعنی سورۂ بقرہ اور اس کے بعد کی سورت یعنی سورۂ آل عمران یہ تو مدینہ شریف میں نازل ہوئی ہیں اور مشرکین مکہ ان کے اترنے کے وقت وہاں تھے ہی نہیں پھر ان میں یہ حروف کیوں آئے؟ ہاں یہاں پر ایک اور حکمت بھی بیان کی گئی ہے کہ ان حروف کے لانے میں قرآن کریم کا ایک معجزہ ہے جس سے تمام مخلوق عاجز ہے کہ باوجودیکہ یہ حروف بھی روزمرہ کے استعمالی حروف سے ترکیب دیئے گئے ہیں لیکن مخلوق کے کلام سے بالکل نرالے ہیں۔ مبرد اور محققین کی ایک جماعت اور فراء اور قطرب سے بھی یہی منقول ہے زمخشری نے تفسیر کشاف میں اس قول کی بہت کچھ تائید کی ہے۔ شیخ امام علامہ ابو العباس حضرت ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ مجتہد ابو الحجاج مزی نے بھی یہی حکمت بیان کی ہے۔ زمخشری فرماتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ تمام حروف اکھٹے نہیں آئے۔ ہاں ان حروف کو مکرر لانے کی یہ وجہ ہے کہ بار بار مشرکین کو عاجز اور لاجواب کیا جائے اور انہیں ڈانٹا اور دھمکایا جائے۔ جس طرح قرآن کریم میں اکثر قصے کئی کئی مرتبہ لائے گئے ہیں اور بار بار کھلے الفاظ میں بھی قرآن کے مثل لانے میں ان کی عاجزی کا بیان کیا گیا ہے بعض جگہ تو صرف ایک ایک حرف آیا ہے

جیسے صٓ نٓ قٓ کہیں دو حروف ہیں جیسے حٰمٓ کہیں تین حروف آئے ہیں جیسے الٓمٓ کہیں چار آئے ہیں جیسے الٓمٓرٰ اور الٓمٓصٓ اور کہیں پانچ آئے ہیں جیسے کٓھٰیٰعٓصٓ اور حٰمٓ عٓسٓقٓ اس لئے کہ کلماتِ عرب کل کے کل اسی طرح پر ہیں یا تو ان میں ایک حرفی لفظ ہیں یا دو حرفی لفظ یا سہ حرفی یا پانچ حروف کے۔ پانچ حروف سے زیادہ کے کلمات نہیں۔ جب یہ بات ہے کہ یہ حروف قرآن شریف میں بطور معجزے کے آئے ہیں تو ضروری تھا کہ جن سورتوں کے شروع میں یہ حروف آئے ہیں وہاں ذکر بھی قرآن شریف کی بزرگی اور بڑائی کا بیان ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہے۔ انتیس سورتوں میں یہ واقع ہوا ہے۔ سنئے فرمان ہے الٓمٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ یہاں بھی ان حروف کے بعد ذکر ہے کہ اس قرآن کے خدا کا کلام ہونے میں کوئی شک نہیں اور جگہ فرمایا الٓمٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ اور دوام والا ہے۔ جس نے تم پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے۔ جو کتاب پہلے کی کتابوں کی بھی تصدیق کرتی ہے۔ یہاں بھی ان حروف کے بعد قرآن کریم کی عظمت کا اظہار کیا گیا۔ اور جگہ فرمایا الٓمٓصٓ ۝ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ الخ یعنی یہ کتاب تیری طرف اتاری گئی ہے تو اپنا دل تنگ نہ رکھ۔ اور جگہ فرمایا الٓرٰ ۝ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ الخ اس کتاب کو ہم نے تیری طرف نازل کیا تاکہ تو لوگوں کو اپنے رب کے حکم سے اندھیروں سے نکال کر اجالے میں لائے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ الٓمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اس کتاب کے رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ فرماتا ہے حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ بخششوں اور مہربانیوں والے خدا نے اسے نازل فرمایا۔ حٰمٓ عٓسٓقٓ ۝ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ الخ یعنی اسی طرح وحی کرتا ہے اللہ تعالیٰ غالب حکمتوں والا تیری طرف اور ان نبیوں کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے۔ اسی طرح اور ایسی سورتوں کے شروع کو بغور دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان حروف کے بعد کلام پاک کی عظمت و عزت کا ذکر ہے جس سے یہ بات قوی معلوم ہوتی ہے کہ یہ حروف اس لئے لائے گئے ہیں کہ لوگ اس کے معارضے اور مقابلے سے عاجز ہیں واللہ اعلم۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان حروف سے مدت معلوم کرائی گئی ہے اور فتنوں لڑائیوں اور دوسرے ایسے ہی کاموں کے اوقات بتلائے گئے ہیں لیکن یہ بھی بالکل ضعیف معلوم ہوتا ہے۔ اس کی دلیل میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے۔ لیکن اول تو وہ ضعیف ہے دوسرے اس حدیث سے اس قول کی پختگی تو ایک طرف اس کا باطل ہونا زیادہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ حدیث محمد بن اسحاق بن یسار نے وارد کی ہے جو تاریخ کے مصنف ہیں۔ اس حدیث میں ہے کہ ابو یاسر بن اخطب یہودی اپنے ساتھیوں کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا آپؐ اس وقت سورۂ بقرہ کی شروع آیت الٓمٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ تلاوت فرما رہے تھے وہ اسے سنکر اپنے بھائی حیی بن اخطب کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے آج حضورؐ کو اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے وہ پوچھتا ہے تو نے خود سنا؟ اس نے کہا ہاں میں نے خود سنا ہے۔ حیی ان سب یہودیوں کو لیکر پھر حضورؐ کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے حضورؐ کیا یہ سچ ہے کہ آپ اس آیت کو پڑھ رہے تھے! آپؐ نے فرمایا ہاں سچ ہے۔ اس نے کہا سنئے! آپ سے پہلے جتنے نبی آئے کسی کو بھی نہیں تلایا گیا تھا کہ اس کا ملک اور مذہب کب تک رہے گا۔ لیکن آپ کو تلا دیا گیا۔ پھر کھڑا ہو کر لوگوں سے کہنے لگا سنو! الف کا عدد ہوا ایک۔ لام کے تیس ۳۰ میم کے چالیس ۴۰ جملہ اکہتر ۷۱ ہوئے۔ کیا تم اس نبی کی تابعداری کرنا چاہتے ہو جس کے ملک اور امت کی مدت کل اکہتر ۷۱ سال ہو؟ پھر حضورؐ کی طرف متوجہ ہو کر دریافت کیا کہ کوئی اور آیت بھی ایسی ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں الٓمٓصٓ ۝ کہنے لگا یہ بڑی بھاری اور بہت لمبی ہے۔ الف کا ایک لام کے تیس ۳۰ میم کے چالیس ۴۰ صواد کے نوے ۹۰ یہ سب ایک سو اکسٹھ ۱۶۱ سال ہوئے۔ کہا اور کوئی بھی ایسی آیت ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں الٓرٰ ۝ کہنے لگا یہ بھی بہت بھاری اور لمبی ہے۔ الف کا ایک، لام کے تیس ۳۰ اور رے کے دو سو۔ جملہ دو سو اکتیس ۲۳۱ برس ہوئے۔ کیا اس کے ساتھ کوئی اور ایسی آیت بھی ہے؟ فرمایا ہاں الٓمٓرٰ کہا یہ تو بہت ہی بھاری ہے۔ الف کا ایک، لام کے تیس ۳۰ میم کے چالیس ۴۰ رے کے دو سو سب ملکر دو سو اکہتر ۲۷۱ ہو گئے اب تو کام مشکل ہو پڑا اور بات غلط ہو گئی۔ لوگو! چلو اٹھ چلو۔ ابو یاسر نے اپنے بھائی سے اور دوسرے علماء یہود سے کہا کیا عجب کہ ان سب حروف کا مجموعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہو اکہتر ایک۔ ایک سو اکسٹھ ۱۶۱ ایک، دو سو اکتیس ۲۳۱ ایک، دو سو اکہتر ۲۷۱ ایک، یہ سب ملا کر سات سو چار ۷۰۴ برس ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ اب کام

خلط ملط ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیتیں انہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئیں۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ الخ یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر کتاب نازل فرمائی جس میں محکم آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور دوسری آیتیں مشابہت والی بھی ہیں اس حدیث کا دارومدار محمد بن سائب کلبی پر ہے اور جس حدیث کا اکیلا راوی ہو محدثین اس سے حجت نہیں اور پھر اس طرح اگر مان لیا جائے اور ہر ایسے حرف کے عدد نکالے جائیں تو جن چودہ حروف کو ہم نے بیان کیا ان کے عدد بہت سارے ہو جائیں گے اور جو حروف النّاس سے کئی کئی بار آئے ہیں ان کے عدد کا شمار بھی کئی بار لگایا جائے تو بہت ہی بڑی گنتی ہو جائیگی واللہ اعلم۔

## ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ②

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو......

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہاں ذٰلِكَ معنی میں ھٰذَا کے ہے۔ مجاہد عکرمہ سعید بن جبیر سدی مقاتل بن حیان زید بن اسلم اور ابن جریجؒ کا بھی یہی قول ہے یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے قائم مقام عربی میں اکثر آتے رہتے ہیں حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو عبیدہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذٰلِكَ اصل میں ہے تو دور کے اشارے کیلئے جس کے معنی ہیں "وہ" لیکن کبھی نزدیک کیلئے بھی لاتے ہیں اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں "یہ" یہاں بھی اسی معنی میں ہے۔ زمخشری کہتے ہیں۔ اس سے الٓمٓ کیطرف ہے۔ جیسے اس آیت میں ہے۔ لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ یعنی نہ تو وہ گائے بڑھیا ہے نہ بچہ ہے بلکہ اسکے درمیانی عمر کی جوان ہے۔ اور جگہ فرمایا ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ یہ ہے اللہ کا حکم جو تمہارے درمیان حکم کرتا ہے اور جگہ فرمایا ذٰلِكُمُ اللّٰهُ یہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کی مثال اور مواقع جو پہلے گذر چکے۔ واللہ اعلم۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے اشارہ ہے قرآن کریم کی طرف، جس کے اتارنے کا وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تھا۔ بعض نے توراۃ کی طرف، کسی نے انجیل کی طرف بھی اشارہ بتلایا ہے اور اسی طرح کے دس قول ہیں۔ لیکن ان کو اکثر مفسرین نے ضعیف کہا ہے۔ واللہ اعلم۔ کِتَابٌ سے مراد قرآن کریم ہے۔ جن لوگوں نے کہا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا اشارہ توراۃ اور انجیل کی طرف ہے۔ انہوں نے نہایت دُور کا راستہ لیا اور بڑی تکلیف اٹھائی اور خواہ مخواہ بلاوجہ وہ بات کہی جس کا انہیں علم نہیں۔ رَيْبٌ کے معنی ہیں شک اور شبہ۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن مسعودؓ اور کئی ایک صحابہؓ سے یہی معنی مروی ہیں..... ابو درداؓ ابن عباسؓ مجاہد سعید بن جبیر ابو مالک نافع جو ابن عمرؓ کے مولا ہیں۔ عطا ابو عالیہ ربیع بن انس مقاتل بن حیان سدی قتادہ اسمٰعیل بن ابو خالدؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ ابن ابی حاتمؒ فرماتے ہیں مفسرین میں اس میں اختلاف نہیں۔ رَيْبٌ کا لفظ عرب شاعروں کے شعروں میں تہمت کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اور حاجت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس جملے کے معنی یہ ہوئے کہ اس قرآن کے خدا کی طرف نازل شدہ ہونے میں کچھ شک نہیں، جیسا کہ سورۂ سجدہ میں ہے الٓمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ یعنی بے شک یہ قرآن کریم تمام جہانوں کے پالنے والے خدا کی طرف سے اُترا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہ خبر ہے مگر معنی میں نہی کے ہے یعنی اس میں شک نہ کرو۔ بعض قاری لَا رَيْبَ پر وقف کرتے ہیں اور فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ کو الگ جملہ پڑھتے ہیں، لیکن لَا رَيْبَ فِيْهِ پر ٹھیرنا بہت بہتر ہے کیونکہ یہی مضمون اسی طرح سورۂ سجدہ کی آیت میں گذر چکا ہے اور اس میں بہ نسبت فِيْهِ هُدًى کے زیادہ مبالغہ ہے هُدًى نحوی اعتبار سے صفت ہو کر مرفوع ہو سکتا ہے اور حال کی بناء پر منصوب بھی ہو سکتا ہے۔ اس جگہ ہدایت کو متقین کے ساتھ خاص کیا۔ جیسے اور جگہ فرمایا قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاۗءٌ الخ یعنی یہ قرآن ہدایت اور شفا ہے ایمان والوں کے لیے اور بے ایمانوں کے کان بوجھل ہیں اور آنکھیں اندھی ہیں۔ یہ بہت دُور کی جگہ سے پکارے جاتے ہیں وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ الخ یعنی یہ قرآن ایمانداروں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالم لوگ تو اپنے خسارے میں ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ اس مضمون کی اور آیتیں بھی ہیں اور ان سب کا مطلب یہ ہے کہ گو قرآن کریم خود ہدایت اور محض ہدایت ہے اور سب کیلئے ہے لیکن اس ہدایت سے

نفع اٹھانیوالے صرف نیک بخت لوگ ہیں۔ جیسا کہ فرمایا يَآ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ الخ لوگو تمہارے پاس خداوند تعالیٰ کی نصیحت اور سینے کی بیماریوں کی شفا آچکی جو مومنوں کیلئے شفا اور رحمت ہے۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور بعض دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ ہدایت سے مراد نور ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں متقین وہ جو ایمان لاکر شرک سے دور رہ کر خداوند تعالیٰ کے احکام بجا لائیں ایک اور روایت میں ہے متقی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذابوں سے ڈر کر ہدایت کو نہیں چھوڑتے اور اسکی رحمت کی اُمید رکھ کر اس کی طرف سے جو نازل ہوا اُسے سچا جانتے رہیں۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ متقی وہ ہے جو حرام سے بچے اور فرائض بجا لائے۔ حضرت اعمشؒ حضرت ابوبکر بن عیاشؒ سے سوال کرتے ہیں کہ متقی کون ہے؟ آپ جواب دیتے ہیں پھر میں نے کہا ذرا حضرت کلبیؒ سے تو دریافت کر لو۔ وہ کہتے ہیں متقی وہ ہیں جو کبیرہ گناہوں سے بچیں۔ اس پر دونوں کا اتفاق ہوتا ہے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں، متقی وہ ہے جس کا وصف اللہ تعالیٰ نے خود اس آیت کے بعد بیان فرمایا کہ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ الخ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب اوصاف متقین میں جمع ہوتے ہیں ترمذی اور ابن ماجہ کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، بندہ حقیقی متقی نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُن چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن میں حرج نہیں۔ اس خوف سے کہ کہیں وہ حرج میں گرفتار نہ ہو جائے۔ امام ترمذی اسے حسن غریب کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم میں ہے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ جب کہ لوگ ایک میدان میں قیامت کے دن روک لیئے جائیں گے اس وقت ایک پکارنیوالا پکاریگا کہ متقی کہاں ہیں؟ اس آواز پر وہ کھڑے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنے بازوں میں لیگا اور بے حجاب انہیں اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا۔ ابوعفیف نے پوچھا۔ حضرت! متقی کون ہیں؟ آپنے فرمایا جو لوگ شرک سے اور بُت پرستی سے بچیں اور خدا کی خالص عبادت کریں وہ اسی عزت کیساتھ جنت میں پہنچائے جائیں گے۔ ہدایت کے معنی کبھی تو دل میں ایمان پیوست ہو جانے کے آتے ہیں۔ اس ہدایت پر تو سوائے خداوند جل وعلا کے اور کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ فرمان ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ یعنی اے نبی جسے تو چاہے ہدایت نہیں دے سکتا۔ فرماتا ہے لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ تجھ پر ان کی ہدایت نہیں۔ فرماتا ہے مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ جسے خدا گمراہ کرے اُسے کوئی ہدایت پر لانے والا نہیں۔ فرمایا۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ الخ یعنی جسے خدا ہدایت دے وہی ہدایت والا ہے اور جسے وہ گمراہ کرے تم ہرگز اس کا نہ کوئی ولی پاؤ گے نہ مرشد۔ اس قسم کی اور آیتیں بھی ہیں اور ہدایت کے معنی کبھی حق کے اور حق کو واضح کر دینے اور حق پر دلالت کرنے اور حق کی طرف راہ دکھانے کے بھی آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ یعنی تو یقیناً سیدھی راہ کی راہبری کرتا ہے اور فرمایا اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لیے ہادی ہے۔ اور جگہ فرمان ہے وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ الخ یعنی ہم نے ثمودیوں کو ہدایت دکھائی لیکن انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر پسند کر لیا۔ فرماتا ہے وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ ہم نے اُسے دونوں راہیں دکھائیں یعنی بھلائی اور برائی کی تقویٰ کے اصل معنی بُری چیزوں سے بچ رہنے کے ہیں۔ اصل میں یہ وقوی ہے وقایت سے ماخوذ۔ نابغہ وغیرہ کے اشعار میں بھی آیا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ سے حضرت عمر بن الخطابؓ نے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کبھی خاردار راستے میں چلنے کا اتفاق ہوا ہے؟ جیسے وہاں کپڑوں کو اور جسم کو بچاتے ہو ایسے ہی گناہوں سے بال بال بچنے کا نام تقویٰ ہے۔ ابن معتز شاعر کا قول ہے ؎

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

یعنی چھوٹے اور بڑے اور سب گناہوں کو چھوڑ دو یہی تقویٰ ہے ایسے رہو جیسے کانٹوں والی راہ پر چلنے والا انسان۔ چھوٹے گناہوں کو بھی ہلکا نہ جانو دیکھو پہاڑ کنکروں سے ہی بنجاتے ہیں۔ ابو درداء اپنے اشعار میں فرماتے ہیں۔ انسان اپنی تمناؤں کا پورا ہونا چاہتا ہے اور خدا کے ارادوں پر نگاہ نہیں رکھتا، حالانکہ ہونا وہی ہے جو خدا کا ارادہ ہو۔ وہ اپنے دنیوی فائدے اور مال کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ حالانکہ اس کا بہترین فائدہ اور عمدہ مال خدا کا تقویٰ ہے۔ ابن ماجہ کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، سب سے عمدہ فائدہ جو انسان حاصل کر سکتا ہے۔ وہ خدا کا ڈر ہے اس کے بعد نیک بیوی ہے کہ خاوند جب اسطرف

دیکھے وہ اُسے خوش کر دے اور حکم دے اُسے بجالائے اور اگر قسم دیدے تو پوری کر دکھائے اور جب وہ موجود نہ ہو تو اس کے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔

# اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ

وہ خدا سے ڈرنیوالے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لائے ہیں۔ چھپی ہوئی چیزوں پر

حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں۔ ایمان کہتے ہیں تصدیق کو حضرت ابن عباسؓ بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت زہری فرماتے ہیں ایمان کہتے ہیں عمل کو۔ ربیع بن انس کہتے ہیں یہاں مراد ایمان لانے سے خوف خداوندی کا دل میں پیدا ہونا ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں ان اقوال میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ یہ تمام تقریباً ایک ہی معنی کو ادا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زبان سے، دل سے اور عمل سے غیب پر ایمان لاتے ہیں اور خدا کا ڈر رکھتے ہیں۔ ایمان کا لفظ شامل ہے اللہ تعالیٰ پر اُس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر ایمان لانیکو اور اس اقرار کی تصدیق عمل کیساتھ کرنیکو میں کہتا ہوں لغت میں ایمان کہتے ہیں صرف سچا مان لینے کو۔ قرآن میں بھی اس معنی میں استعمال آیا ہے۔ جیسے فرمایا یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَیُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝ یعنی اللہ کو مانتے ہیں اور ایمان والوں کو سچا جانتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا تھا وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ کُنَّا صٰدِقِیۡنَ ۝ یعنی تو ہمارا یقین نہیں کریگا اگرچہ ہم سچے ہوں اسی طرح ایمان یقین کے معنی میں آتا ہے اس وقت کہ جب اعمال کے ذکر کے ساتھ ملا ہوا ہو جیسے فرمایا اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ہاں جسوقت اس کا استعمال مطلق ہو تو ایمان شرعی جو خدا کے ہاں مقبول ہے وہ اعتقاد قول اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ اکثر ائمہ کا یہی مذہب ہے بلکہ امام شافعیؒ امام احمدؒ اور امام ابوعبیدؒ وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ایمان نام ہے زبان سے کہنے اور عمل کرنیکا اور ایمان بڑھتا گھٹتا رہتا ہے اور اس کے ثبوت میں بہت سے آثار اور حدیثیں بھی آئی ہیں جو ہم نے بخاری شریف کی شرح میں بیان کی ہیں۔ فالحمد للہ۔ بعضوں نے ایمان کے معنی خدا کے ڈر خوف کے بھی کئے ہیں جیسے فرمان ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَیۡبِ جو لوگ اپنے رب سے در پردہ ڈرتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا مَنۡ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ الخ یعنی جو شخص خدا تعالیٰ سے بِن دیکھے ڈرا ہے اور جھکنے والا دل لیکر آیا ہے۔ حقیقت میں خدا کا خوف ایمان کا اور علم کا خلاصہ ہے۔ جیسے فرمایا اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو ذی علم ہیں۔ بعض کہتے ہیں وہ غیب پر بھی ایسا ہی ایمان رکھتے ہیں۔ جیسا حاضر پر اور ان کا حال منافقوں جیسا نہیں کہ جب ایمان والوں کے سامنے ہوں تو اپنا ایماندار ہونا ظاہر کریں، لیکن جب اپنے والوں میں ہوتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان کا مذاق بناتے ہیں۔ ان منافقین کا حال اور جگہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ الخ یعنی منافق جب تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارے دل کی شہادت ہے کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے، لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق تجھ سے جھوٹ کہتے ہیں اس معنی کے اعتبار سے بِالۡغَیۡبِ حال ٹھیرے گا یعنی وہ ایمان لاتے ہیں۔ درآنحالیکہ لوگوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ غیب کا لفظ جو یہاں ہے اس کے معنی میں بھی مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں اور وہ سب صحیح ہیں اور جمع ہو سکتے ہیں۔ ابو العالیہؒ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ پر فرشتوں پر کتابوں رسولوں پر قیامت پر جنت دوزخ پر ملاقات خداوندی پر مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لانا ہے۔ قتادہ بن دعامہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور بعض دیگر اصحاب سے مروی ہے کہ مراد اس سے وہ پوشیدہ چیزیں ہیں جو نظروں سے اوجھل ہیں جیسے جنت دوزخ وغیرہ وہ اُمور جو قرآن میں مذکور ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں، خدا کی طرف سے جو آیا ہے وہ سب غیب میں داخل ہے۔ حضرت ذرؒ فرماتے ہیں مراد اس سے قرآن ہے۔ عطا بن ابو رباح فرماتے ہیں اللہ پر ایمان لانے والا غیب پر ایمان والا ہے۔ اسماعیل بن ابو خالد فرماتے ہیں مراد اسلام کی تمام پوشیدہ چیزیں ہیں۔ زید بن اسلمؓ کہتے ہیں مراد تقدیر پر ایمان لانا ہے۔ پس یہ تمام اقوال معنی کی رو سے ایک ہی ہیں اس لیے کہ یہ سب چیزیں پوشیدہ ہیں اور غیب کی تفسیر ان سب کو شامل ہے اور سب پر ایمان لانا واجب ہے۔ حضرت عبداللہ

ابن مسعودؓ کی مجلس میں ایک مرتبہ صحابہؓ کے فضائل بیان ہو رہے تھے۔ آپ نے فرمایا حضور کے دیکھنے والوں کو تو آپ پر ایمان لانا ہی تھا، لیکن خدا کی قسم ایمانی حیثیت سے وہ لوگ افضل ہیں جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ پھر آپ نے الٓمّٓ سے لیکر مُفْلِحُوْنَ تک آیتیں پڑھیں (ابن ابی حاتم۔ مردویہ۔ مستدرک حاکم) امام حاکم اس روایت کو صحیح بتلاتے ہیں۔ مسند احمد میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث ہے۔ ابوجمعہ صحابیؓ سے ابن محیریز نے کہا کہ کوئی ایسی حدیث سناؤ جو تم نے خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ فرمایا اچھا میں تمہیں ایک بہت ہی عمدہ حدیث سناؤں۔ ہم نے حضورؐ کے ساتھ ایک مرتبہ ناشتہ کیا۔ ہمارے ساتھ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے انھوں نے کہا یا رسول اللہ! کیا ہم سے بہتر بھی کوئی اور ہے؟ ہم آپ کے ساتھ اسلام لائے، آپ کے ساتھ جہاد کیا۔ آپؐ نے فرمایا ہاں، وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے مجھ پر ایمان لائیں گے۔ حالانکہ انھوں نے مجھے دیکھا بھی نہ ہوگا۔ تفسیر ابن مردویہ میں ہے۔ صالح بن جبیر کہتے ہیں کہ ابوجمعہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے پاس بیت المقدس میں آئے رجاء بن حیوہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہمارے ساتھ ہی تھے جب وہ واپس جانے لگے تو ہم انھیں پہنچانے چلے جب جدا ہونے لگے تو فرمایا تمہاری ان مہربانیوں کا بدلہ اور حق مجھے ادا کرنا چاہیے۔ سنو! میں تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں جسے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ ہم نے کہا اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے ضرور سناؤ کہا سنو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ہم دس آدمی تھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ کیا ہم سے بڑے اجر کا مستحق بھی کوئی ہوگا؟ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپؐ کی تابعداری کی۔ آپؐ نے فرمایا تم کیوں نہ کرتے؟ خدا کا رسول تم میں موجود ہے۔ وحی خداوندی آسمان سے تمہارے سامنے نازل ہو رہی ہے۔ ایمان تو ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد آئیں گے کہ دو جلدوں کے درمیان کتاب پائیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ یہ لوگ اجر میں تم سے دُگنے ہیں۔ اس حدیث میں وجادہ کی قبولیت کی دلیل ہے جسمیں محدثین کا اختلاف ہے۔ میں نے اس مسئلہ کو بخاری شریف کی شرح میں خوب واضح کر دیا ہے۔ اسلئے کہ بعد والوں کی تعریف اسی بنا پر ہو رہی ہے اور ان کا بڑے اجر والا ہونا اسی حیثیت سے ہے ورنہ علی الاطلاق ہر طرح سے بہتر اور افضل تو صحابہ ہی ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ ایک اور حدیث میں ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے پوچھا تمہارے نزدیک ایمان لانے میں کون زیادہ افضل ہیں؟ انھوں نے کہا فرشتے۔ فرمایا وہ ایمان کیوں نہ لاتے وہ تو اپنے رب کے پاس ہی ہیں۔ لوگوں نے کہا پھر انبیاء، فرمایا وہ ایمان کیوں نہ لائیں ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ کہا پھر ہم فرمایا تم ایمان کو قبول کیوں نہ کرتے؟ حالانکہ میں تم میں موجود ہوں۔ سنو، میرے نزدیک سب سے زیادہ افضل ایمان والے وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ صحیفوں میں کتاب لکھی ہوئی پائیں گے اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اسکی سند میں مغیرہ بن قیس ہیں۔ ابوحاتم رازی انھیں منکر الحدیث بتلاتے ہیں، لیکن اسی کے مثل ایک اور حدیث ضعیف سند سے مسند ابویعلی تفسیر ابن مردویہ مستدرک حاکم میں بھی مروی ہے اور حاکم اسے صحیح بتلاتے ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ سے بھی اسی کے مثل مرفوعاً مروی ہے واللہ اعلم۔ ابن ابی حاتم میں ہے حضرت بدیلہ بنت اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ بنو حارثہ کی مسجد میں ہم ظہر یا عصر کی نماز میں تھے اور بیت المقدس کی طرف ہمارا منہ تھا۔ دو رکعت ادا کر چکے تھے کہ کسی نے آکر خبر کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر لیا ہے ہم سنتے ہی گھوم گئے۔ عورتیں مردوں کی جگہ آ گئیں اور مرد عورتوں کی جگہ چلے گئے اور باقی دو رکعتیں ہم نے بیت اللہ شریف کی طرف ادا کیں جب حضورؐ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا یہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں یہ حدیث اس اسناد سے غریب ہے۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ ﴿۳﴾

اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ دیا ہے ہم نے اس کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں . . . .

ابن عباس فرماتے ہیں فرائض نماز بجا لاتے ہیں رکوع سجدہ تلاوت خشوع اور توجہ کو قائم کرتے ہیں قتادہ کہتے ہیں وقتوں کا خیال رکھنا وضو اچھی طرح کرنا رکوع سجدہ پوری طرح کرنا اقامت صلوٰۃ ہے مقاتل کہتے ہیں۔ وقت کی نگہبانی کرنا کامل طہارت کرنا رکوع سجدہ اطمینان سے

کرنا، تلاوت اچھی طرح کرنا، التحیات اور درود پڑھنا اقامت صلوٰۃ ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ کے معنی زکوٰۃ ادا کرنے کے ہیں۔ ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اور بعض صحابہؓ نے کہا ہے کہ اس سے مراد آدمی کا اپنے بال بچوں کو کھلانا پلانا ہے یہ زکوٰۃ کے حکم سے پہلے کی آیت ہے۔ حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی سات آیتیں جو سورۂ برات میں ہیں ان کے نازل ہونے سے پہلے یہ حکم تھا کہ اپنی اپنی طاقت کے مطابق تھوڑا بہت جو میسر ہو دیتے رہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں یہ مال تمہارے پاس خدا کی امانت ہے عنقریب تم سے جدا ہوگا اپنی زندگی میں اسے خدا کی راہ میں لگا دو۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں یہ آیت عام ہے، زکوٰۃ کو اہل وعیال کے خرچ کو اور جن لوگوں کو دینا ضروری ہو ان سب کے دینے کو شامل ہے۔ اسلئے پروردگار نے ایک عام وصف بیان فرمایا ہے اور عام تعریف کی ہے تو ہر طرح کے خرچ کو شامل ہوگی۔ میں کہتا ہوں قرآن کریم میں اکثر جگہ نماز کا اور مال خرچ کرنیکا ذکر ملا جُلا آتا ہے اسلئے نماز خدا کا حق اور اس کی عبادت ہے جو اس کی توحید اس کی ثنا اس کی بزرگی اس کی طرف جھکنے اس پر توکل کرنے اس سے دعا کرنے کا نام ہے اور خرچ کرنا مخلوق کی طرف احسان کرنا ہے جس سے انھیں نفع پہنچے۔ اس کے زیادہ حقدار اہل وعیال اور غلام ہیں۔ پھر دور والے اجنبی۔ پس تمام واجب خرچ اخراجات اور فرائض زکوٰۃ اس میں داخل ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام کی بنائیں پانچ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دینا۔ نماز قائم رکھنا۔ زکوٰۃ دینا۔ رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ اس بارے میں اور بہت سی حدیثیں ہیں۔ عربی لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ عرب شاعروں کے اشعار اس پر شاہد ہیں۔ پھر شریعت میں اسکا استعمال نماز پر ہے۔ جو رکوع وسجود اور دوسرے خاص افعال کا نام ہے مخصوص اوقات میں جملہ شرائط اور صفات اور اقسام کے ساتھ بجا لائی جاتی ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں، نماز کو صلوٰۃ اس لئے کہا جاتا ہے کہ نمازی اللہ تعالیٰ سے اپنے عمل کا ثواب طلب کرتا ہے اور اپنی حاجتیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ جو دو رگیں پیٹھ سے لیکر ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف آتی ہیں انھیں عربی میں صَلَوَیْنِ کہتے ہیں۔ چونکہ نماز میں یہ ہلتی ہیں اس لئے نماز کو صلوٰۃ کہا گیا ہے، لیکن یہ قول ٹھیک نہیں۔ بعضوں نے کہا ہے یہ ماخوذ ہے صلی سے جس کے معنی ہیں چپک جانا اور لازم ہو جانا جیسا کہ قرآن میں ہے لَا يَصْلٰهَآ الخ یعنی جہنم میں ہمیشہ نہ رہے گا مگر بدبخت بعض علماء کا قول ہے کہ جب لکڑی کو درست کرنے کے لئے آگ پر رکھتے ہیں تو عرب تَصْلِيَة کہتے ہیں چونکہ نمازی بھی اپنے نفس کی کجی کو نماز سے درست کرتا ہے اسلئے اسے صلوٰۃ کہتے ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ الخ یعنی نماز ہر بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے لیکن اس کا دعا کے معنی میں ہونا ہی زیادہ صحیح اور زیادہ مشہور ہے۔ واللہ اعلم۔ لفظ زکوٰۃ کو بحث انشاء اللہ آئندہ آئے گی۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④

اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تو جو کچھ خدا کی طرف سے لایا اور تجھ سے پہلے کے انبیاء جو کچھ وہ ان سب کی تصدیق کرتے ہیں یہ نہیں کہ کسی کو مانیں اور کسی کا انکار کریں، بلکہ اپنے رب کی سب باتوں کو مانتے ہیں اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی بعث وقیامت جنت ودوزخ حساب ومیزان سب کو مانتے ہیں۔ قیامت چونکہ دنیا کے فنا ہونیکے بعد آئیگی اسلئے اسے آخرت کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جنکی پہلے ایمان بالغیب وغیرہ کیساتھ صفت بیان کی گئی تھی انہی کی دوبارہ یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں ایمان دار خواہ عرب مومن ہوں خواہ اہل کتاب وغیرہ۔ مجاہد ابو العالیہ ربیع بن انس اور قتادہؒ کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا ہے

یہ دونوں ہیں تو ایک مگر مراد اس سے صرف اہل کتاب ہی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں واؤ عطف کا ہوگا اور صفت کا عطف صفت پر ہو جیسے سَبِّحِ اسْمَ الخ میں صفت کا عطف صفت پر ہے اس طرح کا عطف شعراء کے کلام میں بھی آیا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ پہلی صفتیں تو ہیں عرب مومنوں کی اور وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ الخ سے اہل کتاب سے مومنوں کی صفتیں ہیں سدی نے حضرت ابن عباس ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے نقل کیا ہے اور ابن جریر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے اور اس کی شہادت میں یہ آیت لائے ہیں۔ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ الخ یعنی اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس وحی پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی اور اس وحی پر جو ان کی طرف اتاری گئی ایمان لاتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ الخ یعنی جنہیں اس سے پہلے کی کتاب ہم نے دی تھی وہ اس کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اور جب ان پر یہ قرآن پڑھا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر بھی ایمان لائے اور اسے اپنے رب کی طرف سے حق جانا۔ ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے انہیں ان کے صبر کرنے اور برائی کے بدلے بھلائی کرنے اور راہ خدا میں خرچ کرنے کی وجہ سے دوہرا اجر ملے گا۔ بخاری و مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تین شخصوں کو دوہرا اجر ملیگا۔ ایک اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لائیں اور مجھ پر بھی ایمان رکھیں۔ دوسرا وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی۔ تیسرا وہ شخص جو اپنی لونڈی کو اچھا ادب سکھائے پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کرلے امام ابن جریر کے اس فرق کی مناسبت کس بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس سورت کے شروع میں مومنوں اور کافروں کا بیان ہوا ہے تو جس طرح کفار کی دو قسمیں کی ہیں۔ کافر اور منافق اسی طرح مومنوں کی بھی دو قسمیں کیں۔ عربی مومن اور کتابی مومن۔ میں کہتا ہوں ظاہر ہے کہ حضرت مجاہدؒ کا یہ قول ٹھیک ہے کہ سورہ بقرہ کی اول کی چار آیتیں مومنوں کے اوصاف کے بیان میں ہیں اور دو آیتیں اسکے بعد کی کافروں کے بارے میں اور ان کے بعد کی تیرہ ۱۳ آیتیں منافقوں کے حق میں ہیں۔ پس یہ چاروں آیتیں ہر مومن کے حق میں عام ہیں عربی ہو یا عجمی، کتابی ہو یا غیر کتابی، انسانوں میں سے ہو یا جنات میں سے اسلئے کہ ان میں سے ہر ایک وصف دوسرے کو لازم اور شرط ہے۔ ایک بغیر دوسرے کے نہیں ہو سکتا۔ غیب پر ایمان لانا نماز کو قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا صحیح نہیں جبتک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اگلے انبیاء پر جو کتابیں اتری ہیں ان پر ایمان نہ ہو اور ساتھ ہی آخرت کا یقین کامل نہ ہو جس طرح پہلی تین چیزیں بغیر پچھلی تین چیزوں کے غیر معتبر ہیں۔ اسی طرح پچھلی تینوں بغیر پہلی تینوں کے صحیح نہیں۔ اسی لئے ایمان والوں کو حکم خداوندی ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ الخ یعنی ایمان والو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جو کتاب ان پر اتری ہے اس پر اور جو کتابیں ان سے پہلے اتری ہیں ان پر ایمان لاؤ اور جگہ فرمایا وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ الخ یعنی اہل کتاب سے جھگڑنے میں بہترین طریقہ برتو اور کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا ہے اور جو تمہاری طرف اتارا گیا ہے ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ اور جگہ ارشاد ہے اے اہل کتاب جو ہم نے اتارا ہے اس پر ایمان لاؤ یہ اسکو سچا کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ اور جگہ فرمایا اے اہل کتاب تم کسی چیز پر نہیں ہو جب تک توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے قائم نہ رکھو۔ اور جگہ تمام ایمان والوں کی طرف سے خبر دیتے ہوئے قرآن پاک نے فرمایا۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ الخ رسول ایمان لائے اس پر جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اور تمام ایمان والے بھی۔ ہر ایک ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اسکی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ہم رسولوں میں فرق اور جدائی نہیں کرتے۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن میں کل ایمان والوں کا اللہ تعالیٰ پر اور اس کے تمام رسولوں اور سب کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اہل کتاب کے ایمانداروں کی ایک خاص خصوصیت ہے کیونکہ ان کا ایمان اپنے ہاں کی

کتابوں پر تفصیل کے ساتھ ہوتا ہے اور پھر جب حضورؐ کے ہاتھ پر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو قرآن کریم پر بھی تفصیل کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اسی لئے ان کو دوہرا اجر ملتا ہے اور اس امت کے لوگ بھی اگلی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں لیکن ان کا یہ ایمان اجمالی طور پر ہوتا ہے جیسے صحیح حدیث میں ہے کہ جب تم سے اہل کتاب کوئی خبر بیان کریں تو تم نہ اسے سچا کہو اور نہ اسے جھٹلاؤ۔ بلکہ کہہ دیا کرو کہ جو کچھ ہم پر اترا ہم اسے بھی مانتے ہیں اور جو کچھ تم پر اترا ہے اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ بعض موقعہ پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ حضورؐ پر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان بہ نسبت اہل کتاب کے ایمان کے زیادہ پورا زیادہ کمال والا۔ زیادہ راسخ اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے اس حیثیت سے ممکن ہے کہ انھیں اہل کتاب سے بھی زیادہ اجر ملے گا وہ بسبب اپنے پیغمبر اور پیغمبر آخر الزماںؐ پر ایمان لانے کے دوہرا اجر پائے ہوئے ہوں۔ لیکن یہ لوگ بسبب کمالِ ایمان اجر میں ان سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

## أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑤

بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے۔ اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب۔ ...

یعنی وہ لوگ جن کے اوصاف پہلے بیان ہوئے۔ مثلاً غیب پر ایمان لانا ' نماز قائم رکھنا اللہ کے دیئے ہوئے میں سے دینا حضورؐ پر جو اترا ہے اس پر ایمان لانا ' آپ سے جو کتابیں اتریں ان کو ماننا اور آخرت پر یقین رکھ کر وہاں کام آنے والے نیک عمل کرنا ' برائیوں اور حرام کاریوں سے بچنا ' یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں جنھیں خدا کی طرف سے نور ملا ہے اور بیان و بصیرت حاصل ہوئی ہے۔ اور انہی لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں فلاح اور نجات ہے۔ ابن عباس رضؓ نے ہدایت کی تفسیر نور اور استقامت کی ہے اور فلاح کی تفسیر اپنی چاہت کو پالینے اور برائیوں سے بچ جانے سے کی ہے۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے نور اور دلیل اور ثابت قدمی اور سچائی اور توفیق حق پر ہیں اور یہی لوگ اپنے پاکیزہ اعمال کی وجہ سے نجات ثواب اور جنت کی ہمیشگی کو پانے کے مستحق ہیں اور عذابوں سے دور ہیں۔ ابن جریرؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ دوسرے اُولٰٓئِكَ کا اشارہ اہل کتاب کی طرف ہے جنکی صفت اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا اس اعتبار سے وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ الخ پہلے کی آیت سے جدا ہوگا اور مبتدا بنکر مرفوع ہوگا اور اس کی خبر اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ہوگی ' لیکن پسندیدہ قول یہی ہے کہ اس کا اشارہ پہلے کے سب اوصاف والوں کی طرف ہے۔ اہل کتاب ہوں یا عرب۔ حضرت ابن عباس رضؓ حضرت ابن مسعودؓ اور بعض صحابہؓ سے مروی ہے کہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے مراد عرب کے مومنین ہیں اور اس کے بعد کے جملے سے مراد مومنین اہل کتاب ہیں۔ پھر دونوں کے لئے یہ بشارت ہے کہ یہ لوگ ہدایت اور فلاح والے ہیں۔ اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ آیتیں عام ہیں اور یہ اشارہ بھی عام ہے۔ واللہ اعلم۔ مجاہدؒ ابو العالیہؒ ربیع ابن انسؒ اور قتادہؒ سے یہی مروی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا کہ حضورؐ قرآن پاک کی بعض آیتیں تو ہمیں ڈھارس دیتی ہیں اور امید قائم کرا دیتی ہیں اور بعض آیتیں کمر توڑ دیتی ہیں اور قریب ہوتا ہے کہ ہم ناامید ہو جائیں۔ آپؐ نے فرمایا لو میں تمہیں جنتی اور جہنمی کی پہچان صاف صاف بتلا دوں۔ پھر آپ نے الٓمّٓ سے مُفْلِحُوْنَ ۝ تک پڑھ کر فرمایا یہ تو جنتی ہیں۔ صحابہؓ نے خوش ہو کر فرمایا الحمد للہ ہمیں امید ہے کہ ہم انہی میں سے ہوں گے۔ پھر اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سے عَظِیْمٌ ۝ تک تلاوت کی اور فرمایا یہ جہنمی ہیں۔ انھوں نے کہا ہم لیسے نہیں آپ نے فرمایا ہاں (ابن ابی حاتم)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑥

بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ انکو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لائیں گے

یعنی جو لوگ حق کو پوشیدہ کرنے اور چھپا لینے کے عادی ہیں اور ان کی قسمت میں یہی ہے۔ یہ کبھی خداوند تعالیٰ کی اس وحی کی تصدیق نہ کریں گے۔ جو آپ پر نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ؀ یعنی جن لوگوں پر خدا کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہ لائیں گے، اگرچہ تمام آیتیں دیکھ لیں یہانتک کہ دردناک عذاب دیکھیں اور ایسے ہی شرکش اہل کتاب کی نسبت فرمایا وَلَئِنْ اٰتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ الخ یعنی اہل کتاب کے پاس اگرچہ تمام دلائل لے آؤ تاہم وہ تمہارے قبلہ کو نہیں مانیں گے۔ یعنی ان بدنصیبوں کو سعادت حاصل ہی نہیں ہوئی ان گمراہوں کو ہدایت کہاں؟ تو اے نبی ان پر افسوس نہ کر تیرا کام صرف رسالت کا حق ادا کر دینا اور پہنچا دینا ہے جو مان لیں وہ سعادتمند سعید ہیں وہ مالا مال ہو جائینگے اور اگر کوئی نہ مانے تو نہ بھی تیرا فرض ادا ہو گیا ہم خود ان سے حساب لیں گے۔ تو صرف ڈرا دینے والا ہے۔ ہر چیز پر اللہ تعالیٰ ہی وکیل ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس بات کی بڑی ہی حرص تھی کہ تمام لوگ ایماندار ہو جائیں اور ہدایت کو قبول کر لیں۔ لیکن پروردگار نے فرمایا کہ یہ سعادت ہر ایک کے حصہ کی نہیں۔ یہ نعمت بٹ چکی ہے۔ جس کے حصہ میں آئی ہے وہ آپ کی مانے گا اور جو بدقسمت ہے وہ ہرگز ہرگز اطاعت کیطرف نہ جھکے گا۔ بس یہ ہیکہ جو قرآن سے انکاری ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اگلی کتابوں کو مانتے ہیں انہیں ڈراوے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے کہ وہ خود اپنی کتاب کو بھی حقیقتاً نہیں مانتے کیونکہ تیرے ماننے کا عہد ہے تو جب وہ اس کتاب کو اور اس نبی کی نصیحت کو نہیں مانتے جس کے ماننے کے اقراری ہیں تو بھلا وہ آپ کی تمہاری باتوں کو کیا مانینگے۔ ابو العالیہؒ کا قول ہے یہ آیت جنگ احزاب کے ان سرداروں کے بارے میں اتری ہے جنکی نسبت فرمان باری ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا الخ لیکن جو معنی ہم نے پہلے بیان کئے ہیں وہ زیادہ ظاہر ہیں اور دوسری آیتوں کے مطابق ہیں واللہ اعلم۔

اس حدیث پر جو ابن ابی حاتم کے حوالے سے ابھی بیان ہوئی ہے۔ دوبارہ نظر ڈال جائیے لَا يُؤْمِنُوْنَ پہلے جملے کی تاکید ہے یعنی ڈرانا نہ ڈرانا دونوں برابر ہے۔ دونوں حالتوں میں ان کا کفر نہ ٹوٹے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لَا يُؤْمِنُوْنَ خبر ہو اس لئے کہ تقدیر کلام اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا يُؤْمِنُوْنَ ہے اور سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ جملہ معترضہ ہو جائے گا۔ واللہ اعلم۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے سزا بڑی ہے

حضرت سدیؒ فرماتے ہیں ختم سے مراد طبع ہے یعنی مہر کر دینا حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں یعنی ان پر شیطان غالب آ گیا وہ اسی کے ماتحت ہو گئے یہاں تک کہ مہر خداوندی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر لگ گئی اور آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہدایت کو نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ گناہ لوگوں کے دلوں پر چڑھتے جاتے اور اسے ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ بس یہی طبع اور ختم یعنی مہر ہے۔ دل اور کان کیلئے محاورہ میں مہر آتی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ قرآن میں ران کا لفظ ہے طبع کا لفظ ہے اور اقفال کا لفظ ہے۔ ران طبع سے کم ہے اور طبع اقفال سے کم ہے۔ اقفال سب سے زیادہ ہے۔ حضرت مجاہدؒ نے اپنا ہاتھ دکھا کر کہا کہ دل ہتھیلی کی طرح ہے اور بندے کے گناہ کی وجہ سے وہ سمٹ جاتا ہے اور بند ہو جاتا ہے اس طرح کہ ایک گناہ کیا تو گویا چھنگلیا بند ہو گئی پھر دوسرا گناہ کیا دوسری انگلی بند ہو گئی یہاں تک کہ تمام انگلیاں بند ہو گئیں اور مٹھی بالکل بند ہو گئی جس میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔

اس طرح گناہوں سے دل پر پردے پڑ جاتے ہیں مہر لگ جاتی ہے پھر اس میں حق اثر نہیں کرتا۔ اسے رین بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کا تکبر ان کا حق سے منہ پھیر لینا بیان ہو رہا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اس بات کے سننے سے بہرا بن گیا۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تکبر اور بے پرواہی کر کے اس نے اس بات کی طرف کان نہ لگایا۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں، لیکن یہ مطلب ٹھیک نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہاں تو خود خداوندی تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔ زمخشری نے اس رد کا بہت کچھ رد کیا ہے اور پانچ تاویلیں کی ہیں، لیکن سب کی سب بالکل بودی اور واہی ہیں اور صرف اپنے معتزلی ہونے کی وجہ سے اسے یہ تکلفات کرنے پڑے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ بات بری ہے کہ کسی کے دل پر خداوند قدوس مہر کر دے لیکن افسوس اس نے دوسری صاف اور صریح آیات پر غور نہیں کیا۔ ایک جگہ ارشاد ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ یعنی جب ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے اور فرمایا وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ الخ ہم ان کے دلوں کو اور انکی نگاہوں کو الٹ دیتے ہیں گویا وہ سرے سے ایمان ہی نہ لائے تھے اور ہم انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے ہی چھوڑ دیتے ہیں اس قسم کی اور آیتیں بھی ہیں جو صاف بتلاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور ہدایت کو ان سے دور کر دیا ہے ان کے حق کو ترک کرنے اور باطل پر جمے رہنے کی وجہ سے۔ اور یہ سراسر عدل و انصاف ہے اور عدل اچھی چیز ہے نہ کہ بری۔ اگر زمخشری بھی بغور ان آیات پر نظر ڈالتے تو تاویل نہ کرتے۔ واللہ اعلم۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ امت کا اجماع ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی ایک صفت مہر کرنا بھی بیان کی ہے جو کفار کے کفر کا بدلہ ہے فرماتا ہے بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے خدا نے ان پر مہر لگا دی۔ حدیث میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے دعا میں ہے يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ یعنی اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قائم رکھ۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دلوں پر فتنے اس طرح پیش ہوتے ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے بورئیے کا ایک تنکا جو دل انہیں قبول کر لیتا ہے اس میں ایک سیاہ نکتہ ہو جاتا ہے اور جس دل میں یہ فتنے اثر نہیں کرتے اس میں ایک سفید نکتہ ہو جاتا ہے جس کی سفیدی بڑھتے بڑھتے بالکل صاف سفید ہو کر سارے دل کو منور کر دیتی ہے۔ پھر اسے کبھی کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اس دوسرے دل کی سیاہی بھی پھیلتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے اب وہ الٹے کوزے کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ اچھی بات اسے اچھی لگتی ہے نہ برائی بری معلوم ہوتی ہے الخ امام ابن جریرؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ حدیث میں آ چکا ہے کہ مومن جب گناہ کرتا ہے اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ ہو جاتا ہے اگر وہ باز آ گیا توبہ کر لی اور رک گیا تو وہ نکتہ ہٹ جاتا ہے اور اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ گناہ میں پڑ گیا تو وہ سیاہی بھی پھیلتی جاتی ہے یہاں تک کہ سارے دل پر چھا جاتی ہے یہی وہ ران ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ یعنی یقیناً ان کے دل پر ران ہے ان کی بد اعمالیوں کی وجہ سے (ترمذی نسائی ابن جریر) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے تو معلوم ہوا کہ گناہوں کی زیادتی دلوں پر غلاف ڈال دیتی ہے اور اس کے بعد مہر خداوندی لگ جاتی ہے۔ جسے ختم اور طبع کہا جاتا ہے۔ اب اس دل میں ایمان کے جانے اور کفر کے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ اسی مہر کا ذکر اس آیت خَتَمَ اللّٰهُ الخ میں ہے۔ ہماری آنکھوں دیکھی نظیر ہے کہ جب کسی چیز کا منہ بند کر کے اس پر مہر لگا دیں تو جب تک وہ مہر نہ ٹوٹے گی نہ اس میں کچھ جا سکتا ہے نہ اس میں سے کوئی چیز نکل سکتی ہے۔ اسی طرح جن کفار کے دلوں اور کانوں پر مہر خداوندی لگ چکی ہے ان میں بغیر اس کے ہٹے اور ٹوٹے نہ ہدایت جائے نہ کفر آئے سَمْعِهِمْ پر پورا وقف ہے اور عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ الگ پورا جملہ ہے۔ ختم اور طبع دلوں اور کانوں پر ہوتی ہے اور غشاوت یعنی پردہ آنکھوں پر پڑتا ہے جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ قرآن میں ہے فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ اور جگہ ہے وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ان آیتوں میں دل اور کان پر ختم کا ذکر ہے اور آنکھ پر پردے کا بعضوں نے یہاں غِشَاوَةً زبر کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ تو ممکن ہے کہ ان کے نزدیک فعل جَعَلَ مقدر ہو اور ممکن ہے کہ نصب محل کی اتباع سے ہو جیسے وَحُوْرٌ عِيْنٌ میں۔ شروع سورت کی چار آیتوں میں مومنین کے اوصاف بیان ہوئے پھر ان دو آیتوں میں کفار کا

حاصل بیان ہوا اب منافقوں کا ذکر ہوتا ہے جو بظاہر ایماندار بنتے رہیں لیکن حقیقت میں کفار ہیں چونکہ ان لوگوں کی چالاکیاں عموماً پوشیدہ رہ جایا کرتی ہیں اس لیئے ان کا بیان ذرا تفصیل سے ہوا اور بہت کچھ ان کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں انہی کے بارے میں سورۂ براءت اتری اور انہی کا ذکر سورۂ نور وغیرہ میں کیا گیا تاکہ ان سے پورا بچاؤ ہو اور ان مذموم خصلتوں سے مسلمان دور رہیں۔ پس فرمایا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ⑧ يُخٰدِ

اور ان لوگوں میں بعضے ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں چالبازی

عُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ⑨

کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں (یعنی محض چالبازی کی راہ سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں) اور واقع میں کسی کیساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔

دراصل نفاق کہتے ہیں بھلائی کے ظاہر کرنے اور برائی کے پوشیدہ رکھنے کو۔ نفاق کی دو قسمیں ہیں، اعتقادی اور عملی۔ پہلی قسم کے منافق تو ابدی جہنمی ہیں اور دوسری قسم کے بدترین مجرم ہیں۔ اس کا بیان تفصیل کیساتھ انشاء اللہ کسی مناسب جگہ ہوگا۔ امام ابن جریج ؒ فرماتے ہیں منافق کا قول اس کے فعل کے خلاف اس کی پوشیدگی ظاہر کے خلاف اس کا آنا جانے کے خلاف اس کی موجودگی عدم موجودگی کے خلاف ہوا کرتی ہے۔ نفاق مکہ شریف میں تو تھا ہی نہیں، بلکہ اس کا خلاف تھا بعض لوگ ایسے تھے جو زبردستی سے بظاہر کافروں کا ساتھ دیتے تھے مگر دل میں مسلمان ہوتے تھے، بلکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ میں تشریف لائے اور یہاں پر اوس اور خزرج کے قبائل نے انصار بن کر آپ کا ساتھ دیا اور جاہلیت کے زمانہ کی مشرکانہ بت پرستی ترک کی اور دونوں قبیلوں سے خوش نصیب لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے لیکن یہودی اب تک خداوند تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم تھے۔ ان میں سے صرف حضرت عبداللہ بن اسلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سچے دین کو قبول کیا تھا تب بھی منافقوں کا خبیث گروہ قائم نہ ہوا تھا اور حضور ؐ نے ان یہودیوں سے اور عرب کے بعض اور قبائل سے صلح کر لی تھی۔ اس جماعت کے قیام کی ابتدا یوں ہوئی کہ مدینہ شریف کے یہودیوں کے تین قبیلے تھے بنو قینقاع بنو نضیر اور بنو قریظہ، بنو قینقاع تو خزرج کے حلیف اور بھائی بند بنے ہوئے تھے اور باقی دو قبیلوں کا بھائی چارہ اس سے تھا۔ جب جنگ بدر ہوئی اور اس میں پروردگار نے اپنے دین والوں کو غالب کیا اور شوکت وشان اسلام ظاہر ہوئی اور مسلمان کا سکہ جم گیا اور کفر کا دھڑ ٹوٹ گیا تب یہ ناپاک گروہ قائم ہوا عبداللہ بن اُبی سلول تھا تو خزرج کے قبیلے میں سے لیکن اوس اور خزرج دونوں اسے اپنا بڑا مانتے تھے بلکہ اس کی باقاعدہ سرداری اور بادشاہت کے اعلان کا پختہ ارادہ ہو چلا تھا کہ ان دونوں قبیلوں کا رخ اسلام کی طرف پھر جاتا ہے اور اس کی سرداری یوں ہی رہ جاتی ہے۔ یہ خار تو اس کے دل میں تھا ہی اِدھر اسلام کی روز افزوں ترقی اُدھر لڑائی کی کامیابی نے اسے مخبوط الحواس کر دیا اب اس نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چلنے کا جھٹ سے بظاہر اسلام قبول کر لینے اور بہ باطن کافر رہنے کی ٹھان لی اور جس قدر جماعت اس کے زیر اثر تھی سب کو یہی ہدایت کی اور اس طرح منافقین کی ایک جمعیت مدینہ میں اور مدینہ کے آس پاس قائم ہو گئی۔ ان منافقین میں بحمد اللہ مکی مہاجر ایک بھی نہ تھا، بلکہ یہ بزرگ تو اپنے اہل وعیال مال ومتاع کو نام خدا پر قربان کر کے خدا کے رسول کا ساتھ دے کر آئے تھے رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں یہ منافق اوس اور خزرج کے قبیلوں میں سے تھے اور یہودی بھی جو ان کے طریقے پر تھے قبیلہ اوس اور خزرج کے نفاق کا ان آیتوں میں بیان ہے ابو العالیہ حضرت حسن قتادہ سدی ؒ نے یہی بیان کیا ہے۔ پروردگار عالم نے منافقوں کی بہت سی بدخصلتوں کا یہاں ذکر فرمایا۔ تاکہ ان کے ظاہر حال سے مسلمان دھوکہ میں نہ آجائیں اور انہیں مسلمان خیال کر کے اپنا نہ سمجھ بیٹھیں جس کی وجہ سے کوئی بڑا فساد پھیل جائے۔ یہ یاد رہے کہ بدکاروں کو نیک سمجھنا بھی

بجائے خود بہت بڑا اور نہایت خوفناک امر ہے جس طرح اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ زبانی اقرار تو ضرور کرتے ہیں مگر دل میں انکے ایمان نہیں اسی طرح سورہ منافقوں میں بھی کہا گیا ہے کہ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ الخ یعنے منافق تیرے پاس آکر کہتے ہیں کہ ہماری گواہی ہے کہ آپ رسول اللہ ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے، لیکن چونکہ حقیقت میں منافقوں کا قول ان کے عقیدے کے مطابق نہ تھا اس لیئے باوجود ان لوگوں کے شاندار اور تاکیدی الفاظ کے خداوند تعالیٰ نے انہیں جھٹلا دیا اور سورہ منافقوں میں فرمایا وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ؁ یعنی اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بالیقین منافق جھوٹے ہیں اور یہاں بھی فرمایا وَمَا هُوْ بِمُؤْمِنِيْنَ ؁ یعنی در اصل وہ ایماندار نہیں وہ اپنے ایمان کو ظاہر کر کے اور اپنے کفر کو چھپا کر اپنی جہالت سے اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اسے نفع دینوالی اور خدا کے یہاں چل جانیوالی کاریگری خیال کرتے ہیں۔ جیسا کہ بعض مومنوں پر ان کا یہ مکر چل جاتا ہے قرآن میں اور جگہ ہے يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ الخ یعنی قیامت والے دن جب کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو کھڑا کریگا تو جس طرح وہ دنیا میں ایمان والوں کے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے اور سمجھیں گے کہ وہ بھی کچھ ہیں۔ خبردار! یقیناً وہ جھوٹے ہیں یہاں بھی ان کے اس غلط عقیدے کے مقابلہ میں فرمایا کہ در اصل وہ اپنے اس کام کی برائی کو جانتے ہی نہیں۔ یہ دھوکہ تو خود اپنی جانوں کو دے رہے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ یعنی منافق خدا کو دھوکہ دیتے اور وہ انہیں دے رہا ہے۔ بعض قاریوں نے يَخْدَعُوْنَ پڑھا ہے اور بعض نے يُخٰدِعُوْنَ اور دونوں قراءتوں کے معنیٰ کا مطلب ایک ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایمان والوں کو منافق دھوکہ کیسے دیں گے؟ وہ جو اپنے دل کے خلاف ظاہر کرتے ہیں وہ تو صرف بچاؤ کے لیے ہوتا ہے تو جواباً کہا جائے گا کہ اس طرح کی بات کرنے والے کو بھی جو کسی خوف سے بچنا چاہتا ہے عربی زبان میں مُخَادِعٌ کہا جاتا ہے۔ چونکہ منافق بھی قتل قید اور دنیاوی عذابوں سے محفوظ رہنے کے لیئے یہ چال چلتے تھے اور باطن کے خلاف ظاہری الفاظ کہتے تھے اس لیئے انہیں دھوکہ باز کہا گیا۔ ان کا یہ فعل گو کسی کو دنیا میں کچھ دھوکا دے بھی دے لیکن درحقیقت وہ خود اپنے تئیں دھوکہ دے رہے ہیں۔ اسلئے کہ وہ اسی میں بھلائی اور کامیابی جانتے ہیں اور در اصل یہ سب ہوگا ان کی برائی عذاب اور غضب خداوندی کا جس کے سہنے کی ان میں طاقت نہیں پس یہ دھوکہ حقیقتاً ان پر خود وبال ہوگا وہ جس کام کا انجام اچھا جانتے ہیں ان کے حق میں برا اور بہت برا ہوگا ان کے کفر شک اور تکذیب کی وجہ سے انکا رب ناراض ہوگا لیکن افسوس انہیں اس کا شعور ہی نہیں اور یہ اپنے غلط خیالات میں ہی مست ہیں۔ ابن جریجؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کا اظہار کر کے وہ اپنی جان مال کا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں یہ کلمہ ان کے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتا حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں منافقوں کی یہی حالت ہے کہ زبان پر کچھ دل میں کچھ عمل کچھ عقیدہ کچھ صبح کچھ شام کچھ کشتی کی طرح جو ہوا کے جھونکے سے کبھی ادھر ہو جاتی ہے کبھی ادھر

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ؁

ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے۔ سو اور بھی بڑھا دیا اللہ تعالیٰ نے ان کے مرض کو۔۔ اور ان کے لئے سزائے دردناک ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے

بیماری سے مراد یہاں شک شبہ ہے حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور چند صحابہؓ سے یہی مروی ہے۔ حضرت مجاہد عکرمہ حسن بصری ابو العالیہ ربیع بن انس قتادہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عکرمہ اور طاؤسؒ نے اسکی تفسیر کی ہے ریا سے اور ابن عباس سے اس کی تفسیر نفاق بھی مروی ہے۔ زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں یہاں دینی بیماری مراد ہے نہ کہ جسمانی انہیں اسلام میں شک کی بیماری تھی اور ان کی ناپاکی میں خدا نے اور اضافہ کر دیا۔ جیسا کہ قرآن میں اور جگہ ہے فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ؁ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ یعنی ایمان والوں کے ایمان میں زیادتی کرتی ہے اور وہ خوشیاں مناتے ہیں لیکن بیماری والوں کی ناپاکی اور پلیدی کو اور زیادہ کر دیتی ہے۔ یعنی ان کی بدی اور گمراہی بڑھ جاتی ہے یہ بدلہ بالکل ان کے عمل کے مشابہ ہے یہ تفسیر اچھی ہے ٹھیک

اس کے مثل یہ فرمان بھی ہے وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ یعنی ہدایت والوں کو ہدایت میں بڑھا دیتا ہے اور ان کو تقویٰ عطا فرماتا ہے يُكَذِّبُوْنَ کو يَكْذِبُوْنَ بھی قاریوں نے پڑھا ہے یہ دونوں بد خصلتیں ان میں تھیں جھٹلاتے بھی تھے، اور جھوٹے بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باوجود بعض منافقوں کو اچھی طرح جاننے کے پھر بھی قتل نہ کرنے کی وجہ وہ ہے جو بخاری ومسلم کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ لوگوں میں یہ چرچے ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو اعرابی آس پاس ہیں انہیں یہ تو معلوم نہ ہوگا کہ ان منافقوں کے پوشیدہ کفر کی بناء پر انہیں قتل کیا گیا ہے ان کی نظریں تو صرف ظاہر داری پر ہوں گی جب ان میں یہ بات مشہور ہو جائے گی کہ حضور اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ تو خوف ہے کہ کہیں وہ اسلام قبول کرنے سے رک نہ جائیں۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں ہمارے علماء وغیرہ کا بھی یہی قول ہے ٹھیک اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مولفۃ القلوب کو جن کے دل اسلام کی جانب مائل کیے جاتے ہیں۔ مال عطا فرمایا کرتے تھے باوجودیکہ جانتے تھے کہ ان کے برے عقیدے ہیں۔ حضرت امام مالکؒ بھی منافقوں کو قتل نہ کرنے کی یہی وجہ بیان فرماتے ہیں۔ جیسے محمد بن جہم، قاضی اسمٰعیل اور ابہری نے نقل کیا ہے۔ حضرتؒ سے بقول ابن ماجشون ایک وجہ یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ یہ اس لیے تھا کہ آپ کی امت کو معلوم ہو جائے کہ حاکم اپنے علم پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ قرطبی فرماتے ہیں گو علماء میں تمام مسائل میں اختلاف ہو لیکن اس مسئلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ قاضی صرف اپنی ذاتی معلومات کی بناء پر کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ حضورؐ کا قتل منافقوں سے رکے رہنے کا سبب ان کا اپنے ایمان کو اپنی زبان سے ظاہر کرنا تھا گو اس کا علم تھا کہ ان کے دل اس کے خلاف ہیں۔ لیکن ظاہری کلمہ اس پہلی بات کو ہٹا دیتا تھا۔ اس کی تائید میں بخاری ومسلم وغیرہ کی یہ حدیث بھی پیش کی جا سکتی ہے جس میں ہے کہ مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہیں جب وہ اسے کہہ دیں تو انہوں نے مجھ سے اپنی جانیں اور مال بچا لیا اور ان کا حساب اللہ عزوجل پر ہے مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ شریف کے کہتے ہی ظاہری احکام اسلام ان پر جاری ہو جائیں گے۔ اب اگر ان کا عقیدہ بھی اس کے مطابق ہے تو آخرت والے دن نجات کا سبب ہوگا ورنہ وہاں کچھ بھی نفع نہ ہوگا لیکن دنیا میں تو مسلمانوں کے احکام ان پر جاری رہیں گے گو یہ لوگ یہاں مسلمانوں کی صفوں میں اور ان کی فہرست میں نظر آئیں لیکن آخرت میں عین پلصراط پر ان سے دور کر دیئے جائیں گے اور اندھیروں میں حیران و پریشان ہوتے ہوئے باآواز بلند مسلمانوں کو پکار کر کہیں گے کہ ہم کیا تمہارے ساتھ نہ تھے؟ لیکن وہاں سے جواب ملے گا کہ تھے تو سہی مگر تم فتنوں میں پڑ گئے اور انتظار میں ہی رہ گئے اور اپنی من مانی خواہشوں کے پھیر میں پڑ گئے یہاں تک کہ امر خداوندی آ پہنچا۔ غرض دار آخرت میں بھی مسلمانوں کے پیچھے لگے لپٹے رہیں گے، لیکن بالآخر ان سے الگ کر دیئے جائیں گے اور ان کی امیدوں پر پانی پھر جائیگا وہ چاہیں گے کہ مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑیں لیکن سجدہ نہیں کر سکیں گے، جیسا کہ احادیث میں مفصل بیان آ چکا ہے بعض محققین نے کہا ہے کہ ان کے قتل نہ کئے جانے کی یہ وجہ تھی کہ خدا کے رسول کی موجودگی میں ان کی شرارتیں نہیں چل سکتی تھیں۔ مسلمانوں کو جناب باری اپنی وحی کے ذریعہ ان کی برائیوں سے محفوظ رکھ لیتا تھا، لیکن حضورؐ کے بعد اگر خدانخواستہ ایسے لوگ ہوں کہ ان کا نفاق کھل جائے اور مسلمان بخوبی معلوم کر لیں تو قتل کر دیئے جائیں گے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ نفاق حضورؐ کے زمانہ میں تو تھا، لیکن آج کل تو وہ بے دینی اور زندیقیت ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ زندیق کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے کہ جب وہ کفر ظاہر کرے تو اس کے قتل سے پہلے اس پر توبہ پیش کی جائے یا نہیں؟ اور وہ زندیق جو لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہو اور وہ زندیق جو معلم نہ ہو ان دونوں میں فرق کیا جائے گا یا نہیں؟ اور یہ ارتداد کئی کئی مرتبہ ہوا ہو تب یہ حکم ہے یا صرف ایک مرتبہ پر بھی؟ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ اسلام لانا اور یہ رجوع کرنا خود اس کی اپنی طرف سے ہو یا اس پر غلبہ پا لینے کے بعد بھی یہی حکم ہے؟ غرض ان سب باتوں میں اختلاف ہے، لیکن اس کے بیان کی جگہ احکام کی کتابیں ہیں نہ کہ تفسیر۔ چودہ ۱۴ شخصوں کے نفاق کا تو آپ کو قطعی علم تھا یہ وہ بد باطن لوگ تھے۔ جنہوں نے غزوۂ تبوک میں مشورہ کر کے یہ امر طے کر لیا تھا کہ حضورؐ کے ساتھ دغا بازی کریں آپ کے قتل کی پوری سازش کر چکے تھے کہ رات کے اندھیرے میں جب حضورؐ

فلاں گھاٹی کے قریب پہنچیں تو آپ کی اونٹنی کو بدکا دیں وہ بھڑک کر بھاگے گی اور حضورؐ گھاٹی میں گر پڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی طرف اسی وقت وحی بھیج کر ان کی اس ناپاک غداری کا علم کرا دیا۔ حضورؐ نے حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر اس واقعہ کی خبر دی اور ان غداروں کے نام بھی بتلا دیئے پھر بھی آپ نے ان کے قتل کے احکام صادر نہ فرمائے ان کے سوا اور منافقوں کے نام کا آپ کو علم نہ تھا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ الخ یعنی تمہارے آس پاس کے بعض اعرابی منافق ہیں اور بعض سرکش منافق مدینہ میں بھی ہیں۔ تم انہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں اور جگہ فرمایا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ الخ اگر یہ منافق گندے دل والے اور فساد و تکبر والے اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو ہم بھی انہیں نہ چھوڑیں گے اور مدینہ میں بہت کم باقی رہ سکیں گے، بلکہ ان پر لعنت کی جائے گی۔ جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقوں کا علم نہ تھا کہ کون کون ہیں ہاں ان کی مذموم خصلتیں جو بیان ہوئی تھیں یہ جس میں پائی جاتی تھیں اس پر نفاق صادق آتا تھا۔ جیسے اور جگہ ارشاد فرمایا وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ الخ یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم تمہیں ان کو دکھا دیں، لیکن تم ان کی نشانیوں اور ان کی دبی بھی زبان سے ہی ان کو پہچان لو گے۔

ان منافقوں میں سب سے زیادہ مشہور عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی منافقانہ خصلتوں پر حضورؐ کے سامنے گواہی بھی دی تھی باوجود اس کے جب یہ مرتا ہے تو آپؐ اس کے جنازے کی نماز پڑھاتے ہیں اور اس کے دفن میں شرکت کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح اور مسلمان صحابیوں کے ساتھ بلکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضورؐ کو ذرا زور سے یاد دلایا تو آپ نے فرمایا میں نہیں چاہتا کہ لوگ چہ میگوئیاں کریں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صحابیوں کو مار ڈالا کرتے ہیں اور صحیح روایت میں ہے کہ مجھے اختیار دیا گیا استغفار کرنے نہ کرنے کا۔ تو میں نے کرنے کو پسند کیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اگر ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے میں بھی میں اس کی بخشش جانتا تو یقیناً زیادہ کرتا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَآ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنیوالے ہیں۔ یاد رکھو

اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫

بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس آیت میں بھی منافقوں کا ذکر ہے۔ اور ان کے فساد فی الارض (کفر و معصیت) پر انہیں تنبیہ کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین میں خدا کی نافرمانی کرنا یا نافرمانی کرنے کا حکم دینا زمین میں فساد کرنا ہے اور زمین و آسمان کی اصلاح اطاعتِ خداوندی میں ہے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ انہیں جب خداوند تعالیٰ کی نافرمانی سے روکا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو ہدایت و اصلاح پر ہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں اس خصلت کے لوگ اب تک نہیں آئے۔ مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں یہ بدخصلت لوگ تھے۔ تو سہی، لیکن اب جو آئیں گے وہ ان سے بھی بدتر ہوں گے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس وصف کا کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا ہی نہیں۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ ان منافقوں کا فساد برپا کرنا یہ تھا کہ خداوند تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے تھے جس کام سے خداوند تعالیٰ منع فرماتا تھا اسے کرتے تھے فرائضِ خداوندی ضائع کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سچے دین میں شک و شبہ کرتے اس کی حقیقت اور صداقت پر یقین کامل نہیں رکھتے تھے۔ مؤمنوں کے سامنے آتے تو اپنا ایمان جتاتے۔ حالاں کہ دل اللہ اور رسول کے

بارے میں شک اور وسوسے بھرا پڑا تھا موقع ملتا تو دشمنانِ خدا کی امداد و اعانت کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے مقابلہ میں انکی پاسداری کرتے تھے اور باوجود اس مکاری اور مفسدانہ چال کے اپنے تئیں مصلح اور صلح کل کے حامی جانتے تھے۔ قرآن کریم نے کفار سے موالات اور دوستی رکھنے کو بھی زمین میں فساد سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ یعنی کفار آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اگر تم نے ایسا نہ کیا یعنی ان کفار سے دوستی کی تو زمین میں بھاری فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائیگا۔ اس آیت نے مسلمان اور کفار کے دوستانہ تعلقات منقطع کر دیئے۔ اور جگہ فرمایا اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ خداوند تعالیٰ کا تم پر کھلا غلبہ ہو جائے۔ یعنی تمہاری دلیلِ نجات جائے پھر فرمایا منافق لوگ جہنم کے نچلے طبقہ میں ہوں گے اور ہرگز تم ان کے لئے کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ چونکہ منافقوں کا ظاہر اچھا ہوتا ہے اسلئے مسلمانوں پر حقیقت پوشیدہ رہ جاتی ہے اور وہ ایمانداروں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دھوکہ دے دیتے ہیں اور ان کے بے حقیقت دعوؤں اور کفار کے ساتھ ان کے پوشیدہ دوستیوں سے مسلمانوں کو خطرناک مصائب جھیلنے پڑتے ہیں بس بانی فساد یہ منافقین ہوئے اگر یہ اپنے کفر پر ہی رہتے تو ان کی خوفناک سازشوں اور گہری چالوں کا مسلمانوں کو اتنا نقصان ہرگز نہ پہنچتا اور اگر پورے مسلمان ہو جاتے اور ظاہر و باطن یکساں کر لیتے تب تو دنیا کے امن و امان کے ساتھ آخرت کی نجات و فلاح بھی پا لیتے باوجود اس خطرناک پالیسی کے جب انھیں یکسوئی کی نصیحت کی جاتی تو جھٹ بول پڑتے کہ ہم تو صلح کل ہیں، ہم کسی سے بگاڑنا نہیں چاہتے ہم فریقین کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ وہ کہتے تھے ہم ان دونوں جماعتوں یعنی مومنوں اور اہل کتاب کے درمیان صلح کرانے والے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ نری ان کی جہالت ہے جسے یہ صلح جانتے ہیں وہ عین فساد ہے لیکن انھیں شعور ہی نہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لاوینگے جیسا ایمان لائے ہیں یہ بیوقوف

السُّفَهَاۗءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

یہ یاد رکھو بے شک یہی ہیں بے وقوف، لیکن وہ اس کا علم نہیں رکھتے . . . . . . . .

مطلب یہ ہے کہ جب ان منافقوں کو صحابہ کی طرح اللہ تعالیٰ پر اسکے فرشتوں کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے کو موت کے بعد جی اٹھنے اور جنت دوزخ کی حقانیت کے تسلیم کرنے کو خدا اور رسولوں کی تابعداری کر کے نیک اعمال بجا لانے اور برائیوں سے رکے رہنے کو کہا جاتا ہے تو یہ ملعون فرقہ ایسے ایمان کو بے وقوفوں کا ایمان بتاتا ہے۔ ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہؓ اور ربیع بن انس، عبدالرحمن بن زید بن اسلمؒ وغیرہ نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ سُفَهَآءُ سَفِيْهٌ کی جمع ہے جیسے حکماء حکیم کی اور علماء علیم کی جاہل کم عقل اور نفع نقصان کے پوری طرح نہ جاننے والے کو سفیہ کہتے ہیں۔ قرآن میں اور جگہ ہے وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ الخ بے وقوفوں کو اپنے وہ مال نہ دے بیٹھو جو تمہارے قیام کا سبب ہیں۔ عام مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت میں سفہاء سے مراد عورتیں اور بچے ہیں۔ ان منافقین کے جواب میں یہاں بھی خود پروردگار عالم نے جواب دیا اور تاکیداً حصر کے ساتھ فرمایا بے وقوف تو یہی ہیں، لیکن ساتھ ہی جاہل بھی ایسے ہیں کہ اپنی بے وقوفی کا احساس بھی نہیں رکھتے۔ نہ اپنی جہالت و ضلالت کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی برائی اور ہدایت سے دوری اور کیا ہوگی

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَٰطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا

اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر شریر سرداروں کے پاس تو

نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ⑭ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ⑮

کہتے ہیں کہ بیشک تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو صرف استہزا کیا کرتے ہیں ساللہ تعالیٰ ہی استہزا کر رہے ہیں انکے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران سرگرداں ہو رہے ہیں

مطلب یہ ہے کہ یہ بدباطن مسلمانوں کے پاس آن کر اپنا ایمان اور دوستی اور خیرخواہی ظاہر کر کے انھیں دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ مال و جان کا بچاؤ بھی ہو جائے اور بھلائی اور غنیمت کے مال میں حصہ بھی قائم ہو جائے اور جب اپنے والوں میں ہوتے ہیں تو ان کی سی کہنے لگتے ہیں خلوا کے معنی یہاں ہیں اِنْصَرَفُوْا اور ذَهَبُوْا اور خَلَصُوْا اور مَضَوْا کے یعنی لوٹتے ہیں اور پہنچتے ہیں اور تنہائی میں ہوتے ہیں اور جاتے ہیں پس خَلَوْ جو کہ اِلیٰ کے ساتھ متعدی ہے یہ معنی میں لوٹ جانے کے ہے فعل مضمر اور ملفوظ دونوں پر یہ دلالت کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں اِلیٰ معنی میں مع کے ہے مگر اول ہی ٹھیک ہے اور ابن جریرؒ کے کلام کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ شیاطین سے مراد رؤسا بڑے اور سردار ہیں جیسے یہودی علماء اور سرداران کفار قریش و منافقین حضرت ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہؓ کا قول ہے کہ یہ شیاطین ان کے امراء اور سرداران کفر تھے۔ اور ان کے ہم عقیدہ لوگ بھی۔ یہ شیاطین یہود بھی انھیں پیغمبری کے جھٹلانے اور قرآن کی تکذیب کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے مجاہدؒ کہتے ہیں شیاطین سے مراد ان کے وہ ساتھی ہیں جو یا تو مشرک تھے یا منافق۔ قتادہؒ فرماتے ہیں۔ مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو برائیوں میں اور شرک میں ان کے سردار تھے۔ ابوالعالیہ سدیؒ ربیع بن انسؒ بھی یہی تفسیر کرتے ہیں۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں ہر بہکانے اور سرکشی کرنے والے کو شیطان کہتے ہیں۔ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے قرآن میں بھی شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ آیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ہم جنوں اور انسانوں کے شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ کیا انسان کے شیطان بھی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں جب یہ منافق مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں یعنی جیسے تم ہو ویسے ہی ہم ہیں۔ ہم تو ان کا مذاق بناتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ ربیع بن انسؓ اور قتادہؒ کی یہی تفسیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جواب دیتے ہوئے اس مکروہ فعل کے مقابلہ میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرے گا اور انھیں ان کی سرکشی میں بہکنے دے گا۔ جیسے اور جگہ ہے کہ قیامت کے روز منافق مرد و عورت ایمان والوں سے کہیں گے۔ ذرا ٹھہر جاؤ ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں۔ کہا جائے گا۔ اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور نور کی تلاش کرو۔ ان کے لوٹتے ہی درمیان میں ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہوگا اس طرف تو رحمت ہوگی اس طرف عذاب ہوگا۔ اور جگہ فرمان خداوندی ہے۔ کافر ہماری ڈھیل کو اپنے حق میں بہتر نہ جانیں۔ اس تاخیر میں وہ اپنی بدکرداریوں میں اور بڑھ جاتے ہیں۔ پس قرآن میں جہاں استہزا رسخریت یعنی مذاق مکر خدیعت یعنی دھوکہ کے الفاظ آئے ہیں وہاں یہی مراد ہے۔ ایک اور جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ صرف ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں ان کی بدکرداریوں اور ان کے کفر و شرک پر انھیں ملامت کی گئی ہے اور مفسرین کہتے ہیں یہ الفاظ صرف جواب میں لائے گئے ہیں جیسے کوئی بھلا آدمی کسی مکار کے فریب سے بچ کر اس پر غالب آ کر کہتا ہے کہو میں نے کیسا فریب دیا حالانکہ ان کی طرف سے فریب نہیں ہوتا اسی طرح یہ فرمانِ خداوندی ہے کہ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ اور اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ ورنہ خدا کی ذات مکر اور مذاق سے پاک ہے مطلب یہ ہے کہ ان کا فن فریب انھی کو برباد کرتا ہے۔ ان الفاظ کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ان کی ہنسی دھوکہ تمسخر اور مذاق کا ان کو بدلہ دے گا تو بدلے میں بھی وہی الفاظ استعمال کئے گئے معنی دونوں لفظوں کے دونوں جگہ جدا جدا ہیں۔ دیکھیے قرآن کریم میں ہے۔ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا یعنی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ جو تم پر زیادتی کرے تم بھی

اس پر زیادتی کرو تو ظاہر ہے کہ برائی کا بدلہ لینا حقیقتاً برائی نہیں۔ زیادتی کے مقابلہ میں بدلہ لینا زیادتی نہیں لیکن لفظ دونوں جگہ ایک ہی ہے حالانکہ پہلی برائی اور زیادتی ظلم ہے اور دوسری برائی اور زیادتی عدل ہے لیکن لفظ دونوں جگہ ایک ہے اسی طرح جہاں جہاں کلام اللہ میں ایسی عبارتیں ہیں وہاں یہی مطلب ہے۔ ایک اور مطلب بھی سنئے دنیا میں یہ منافق اپنی اس پلید پالیسی سے مسلمانوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ خدا نے بھی ان کے ساتھ یہی کیا کہ دنیا میں انھیں امن و امان مل گیا اب یہ مست بن گئے۔ حالانکہ یہ عارضی امن ہے قیامت والے دن انھیں کوئی امن نہیں۔ یہاں گو ان کے مال اور ان کی جانیں بچ گئیں لیکن خدا کے یہاں دردناک عذاب کا شکار ہوں گے۔ امام جریرؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور اسکی بہت کچھ تائید کی ہے۔ اسلئے کہ مکر دھوکہ اور مذاق جو بلاوجہ ہو اس سے تو خدا کی ذات پاک ہاں انتقام اور بدلے کے طور پر یہ الفاظ خدا کی نسبت کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی یہی فرماتے ہیں کہ یہ ان سے بدلہ ہے۔ ...... اور ان کی سزا ہے۔ یَمُدُّهُمْ کا مطلب ڈھیل دینا اور بڑھانا بیان کیا گیا ہے جیسا کہ فرمایا اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ الخ یعنی کیا یہ یوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کے مال اولاد کی زیادتی ان کیلئے کوئی بھلی چیز ہے، نہیں نہیں انھیں صحیح شعور ہی نہیں ہے اور فرمایا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ اس طرح ہم انھیں ڈھیل دے کر پکڑیں گے کہ انھیں پتہ بھی نہ چلے۔ تو مطلب ہوا کہ ادھر یہ گناہ کرتے ہیں ادھر دنیوی نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں یہ خوش ہو جاتے ہیں حالانکہ دراصل وہ عذاب ہی ہے۔ قرآن پاک نے اور جگہ فرمایا فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ حَتّٰٓی اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یعنی جب ان لوگوں نے نصیحت بھلا دی ہم نے ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک وہ اپنی چیزوں پر نازاں ہو گئے تو ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا اب گھبرا گئے ظالموں کی بربادی ہوئی اور کہدیا گیا کہ تعریفیں رب العالمین کے لئے ہی ہیں۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ انھیں ڈھیل دینے اور انھیں اپنی سرکشی اور بغاوت میں بڑھنے کے لئے ان کو زیادتی دی جاتی ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ الخ طغیان کہتے ہیں کسی چیز میں گھس جانے کو۔ جیسے فرمایا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں وہ اپنے کفر میں گر جاتے ہیں۔ عمہ کہتے ہیں گمراہی کو تو اس جملے کا مطلب یہ ہوا کہ ضلالت و کفر میں ڈوب گئے اور اس ناپاکی نے انھیں گھیر لیا اب یہ اسی دلدل میں اترے جاتے ہیں اور اسی ناپاکی میں پھنسے جاتے ہیں اور چھٹکارے کی تمام راہیں ان پر بند ہو گئی ہیں۔ بھلا ایسے دلدل میں ہو اور پھر اندھا بہرا اور بے وقوف ہو وہ کیسے نجات پا سکتا ہے آنکھوں کے اندھے پن کیلئے عربی میں عَمٰی کا لفظ آتا ہے اور دل کے اندھے پن کیلئے عَمَهٌ کا لیکن کبھی دل کے اندھے پن کے لئے بھی عَمٰی کا لفظ آتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے۔ وَلٰكِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ۝

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ۝

یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی کی بجائے ہدایت کے۔ تو سود مند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔۔

حضرت ابن عباس ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم سے مروی ہے کہ انھوں نے ہدایت چھوڑ دی اور گمراہی لے لی۔ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں انھوں نے ایمان کے بدلہ کفر قبول کیا۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں ایمان لائے پھر کافر ہو گئے قتادہؒ فرماتے ہیں ہدایت پر گمراہی کو یہ پسند کرتے ہیں۔ جیسے اور جگہ قوم ثمود کے بارے میں ہے فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْهُدٰی یعنی باوجودیکہ ہم نے قوم ثمود کو راہ دکھا دی مگر پھر بھی انھوں نے اس رہنمائی کے بجائے بے راہی کو پسند کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ منافقین ہدایت سے ہٹ کر گمراہی پر آ گئے اور ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی گویا ہدایت کو بیچ کر گمراہی لی۔ اب ایمان لا کر پھر کافر ہوئے ہوں خواہ سرے سے ایمان ہی نصیب نہ ہوا ہو اور ان منافقین میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ یہ اسلئے ہے کہ یہ لوگ ایمان لا کر پھر کافر ہو گئے۔ پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی اور ایسے بھی

منافق تھے جنھیں ایمان نصیب ہی نہ ہو۔ پس نہ تو انھیں اس سودے میں فائدہ ہوا نہ راہ ملی، بلکہ ہدایت کے چمنستان سے نکل کر گمراہی کے خارزار میں، اور جماعت کے مضبوط قلعہ سے نکل کر انتشار اور افراتفری میں پڑ گئے، امن کے وسیع میدان سے نکل کر خوف کی اندھیری کوٹھڑی میں اور سنت کے پاکیزہ گلشن سے نکل کر بدعت کے پژمردہ جنگل میں آ گئے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ

ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کی گرداگرد کی سب چیزوں کو ایسی حالت میں

وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

سلب کر لیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں۔ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے۔

مثال کو عربی میں مثیل بھی کہتے ہیں۔ اسکی جمع اَمْثَالٌ آتی ہے۔ جیسے قرآن میں ہے وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ الخ یعنی یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جنھیں صرف عالم ہی سمجھتے ہیں۔ آیت شریف کا مطلب یہ ہے کہ منافق جو گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور اندھے پن کو بینائی کے بدلے مول لیتے ہیں ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو اندھیرے میں آگ جلائے اس سے دائیں بائیں کی چیزیں اسے نظر آنے لگیں پریشانی دور ہو اور فائدہ کی امید بندھے کہ دفعتاً آگ بجھ جائے اور سخت اندھیرا چھا جائے نہ تو نگاہ کام کرے نہ راستہ معلوم ہو سکے۔ اور باوجود اس کے وہ شخص خود بہرہ ہو کسی کی بات کو نہ سن سکتا ہو۔ گونگا ہو۔ کسی سے دریافت نہ کر سکتا ہو اندھا ہو جو روشنی سے کام نہ چلا سکتا ہو۔ اب بھلا یہ راہ کیسے پا سکے گا؟۔ ٹھیک اسی طرح منافق بھی ہیں کہ ہدایت کو چھوڑ کر یہ راہ گم کر بیٹھے اور بھلائی کو چھوڑ کر برائی کو چاہنے لگے۔ اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے ایمان قبول کر کے کفر کیا تھا۔ جیسے قرآن کریم میں کئی جگہ یہ صراحت موجود ہے۔ واللہ اعلم۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں سدی سے یہی نقل کیا ہے پھر کہا ہے کہ یہ تشبیہ بہت ہی درست اور صحیح ہے اسلئے کہ اولاً تو ان منافقوں کو نور ایمان حاصل ہوا پھر ان کے نفاق کی وجہ سے وہ بجھ گیا اور حیرت میں پڑ گئے اور دین کی حیرت سے بڑی حیرت اور کیا ہوگی؟۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ جنکی مثال بیان کی گئی ہے انھیں کسی وقت بھی ایمان نصیب ہی نہ ہوا تھا کیونکہ پہلے فرمان خداوندی گذر چکا ہے کہ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ یعنی گو یہ زبان سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان لانیکی کہتے ہیں مگر حقیقتاً یہ ایماندار نہیں لیکن ٹھیک بات یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں ان کے کفر و نفاق کے وقت کی خبر دی گئی ہے اس سے اس کا انکار نہیں ہوتا کہ اس حالت کفر و نفاق سے پہلے کبھی انھیں ایمان حاصل ہی نہیں ہوا ممکن ہے ایمان لائے ہوں پھر اس سے ہٹ گئے اور اب دلوں پر مہریں لگ گئی ہوں دیکھئے اور جگہ قرآن کریم میں ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا الخ یہ اس لئے ہے کہ انھوں نے ایمان کے بعد کفر کیا پھر ان کے دلوں پر مہر لگ گئی اب وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثال میں روشنی اور اندھیرے کا ذکر ہے یعنی کلمۂ ایمان کو ظاہر کرنیکی وجہ سے دنیا میں کچھ نور ہو گیا لیکن کفر کے چھپانے کی وجہ سے پھر آخرت کے اندھیروں نے گھیر لیا۔ ایک جماعت کی مثال شخص واحد سے اکثر آیا کرتی ہے قرآن پاک میں اور جگہ ہے رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِىْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ تو دیکھے گا کہ وہ تیری طرف آنکھیں پھیر پھیر کر اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح وہ شخص جو سکرات موت میں ہو اور اس آیت کو بھی دیکھئے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ تم سب کا پیدا کرنا اور مار ڈالنے کے بعد پھر زندہ کر دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک جان کا تیسری جگہ توراۃ کو سیکھ کر عمل عقیدہ اسکے مطابق نہ رکھنے والوں کی مثال میں کہا گیا ہے كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا گدھے کے مانند ہیں جو کتابیں لادے ہوئے ہو۔ ان سب آیتوں میں جماعت کی مثال ایک سے دی گئی ہے اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں منافقوں کی جماعت کی مثال ایک شخص سے

دی گئی بعض کہتے ہیں تقدیر یہ کلام یوں ہے مَثَلُ قِصَّتِهِمْ كَمَثَلِ قِصَّةِ الَّذِيْنَ اسْتَوْقَدُوْا نَارًا یعنی ان کے واقعہ کی مثال ان لوگوں کے واقعہ کی طرح ہے جو آگ روشن کریں۔ بعض کہتے ہیں کہ آگ جلانے والا تو ایک ہے لیکن جلاتا ہے، ایک جماعت کے لئے جو اس کے ساتھ ہے اور لوگ کہتے ہیں اَلَّذِیْ یہاں معنی میں اَلَّذِیْنَ کے ہے جیسا کہ شاعروں کے اشعار میں بھی آتا ہے۔ میں کہتا ہوں خود مثال میں بھی واحد کے صیغہ کے بعد ہی جمع کے صیغے ہیں۔ بِنُوْرِهِمْ اور تَرَكَهُمْ اور لَا يَرْجِعُوْنَ اس طرح کلام میں اعلیٰ فصاحت اور بہترین خوبی آگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روشنی لے گیا اس سے مطلب یہ ہے کہ جو نور نفع دینے والا تھا وہ تو ان سے ہٹا لیا اور جس طرح آگ کے بجھ جانے کے بعد تپش اور دھنواں اور اندھیرا رہ جاتا ہے اسی طرح ان کے پاس نقصان پہنچانے والی چیز یعنی شک، کفر و نفاق رہ گیا نہ تو راہ راست کو خود دیکھ سکیں نہ دوسرے کی بھلی بات سن سکیں نہ کسی سے بھلائی کا سوال کر سکیں۔ اب پھر لوٹ کر ہدایت پر آنا محال ہو گیا اسکی تائید میں مفسرین کے اقوال سنئے حضرت ابن عباس ابن مسعود اور بعض اور صحابہ رضوان اللہ علیہم فرماتے ہیں، حضورؐ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد کچھ لوگ اسلام میں آئے مگر پھر منافق بن گئے ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو اندھیرے میں ہو پھر آگ جلا کر روشنی حاصل کرے اور آس پاس کی بھلائی برائی دیکھنے لگے اور معلوم کرے کہ کس راہ میں کیا ہے؟ کہ اچانک آگ بجھ جائے۔ روشنی جاتی رہے۔ اب معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس راہ میں کیا کیا ہے؟ اسی طرح منافق شرک و کفر کی ظلمت میں تھے پھر اسلام لا کر بھلائی برائی یعنی حلال حرام وغیرہ دیکھنے لگے مگر پھر کافر ہو گئے اور حرام و حلال خیر و شر میں کچھ تمیز نہ رہی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں نور سے مراد ایمان اور ظلمت سے مراد ضلالت و کفر ہے یہ لوگ ہدایت پر تھے لیکن پھر سرکشی کر کے بہک گئے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں ایمانداری اور ہدایت کی طرف رخ کرنے کو مثال میں آس پاس کی چیز کے روشن کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عطا خراسانی کا قول ہے کہ منافق کبھی کبھی بھلائی کو دیکھ لیتا ہے اور پہچان بھی لیتا ہے، لیکن پھر اس کے دل کا اندھاپن اس پر غالب آجاتا ہے۔ عکرمہ، عبدالرحمٰن حسن، سدی اور ربیع سے بھی یہی منقول ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں منافقین کی یہی حالت ہے کہ ایمان لاتے ہیں اور اس کی پاکیزہ روشنی سے ان کے دل جگمگا اٹھتے ہیں جس طرح آگ کے جلانے سے آس پاس کی چیزیں روشن ہو جاتی ہیں، لیکن پھر کفر کی وجہ سے وہ روشنی ختم ہو جاتی ہے جس طرح آگ کے بجھ جانے سے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہ سب اقوال تو ہماری اس تفسیر کی تائید میں تھے کہ جن منافقوں کی یہ مثال بیان کی گئی ہے وہ ایمان لا چکے تھے پھر کفر کیا۔ اب امام ابن جریرؒ کی تائید میں جو تفسیر ہے اسے بھی سنئے! ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ مثال منافقوں کی ہے کہ وہ اسلام کی وجہ سے عزت پا لیتے ہیں، مسلمانوں میں نکاح ورثہ اور تقسیم مال غنیمت ہونے لگتا ہے لیکن مرتے ہی یہ عزت کھوئی جاتی ہے جس طرح آگ کی روشنی آگ بجھتے ہی جاتی رہتی ہے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں جب منافق لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہے دل میں نور پیدا ہوتا ہے پھر جہاں شک کیا وہ نور گیا۔ جس طرح لکڑیاں جب تک جلتی رہیں روشنی رہی جہاں بجھیں روشنی ختم ہوئی۔ ضحاک فرماتے ہیں نور سے مراد ایمان ہے جو ان کی زبانوں پر تھا۔ قتادہؒ کہتے ہیں لا الٰہ الا اللہ ان کے لئے روشنی کر دیتا تھا امن و امان، کھانا پینا، جورو بچے، سب ملجاتے تھے، لیکن شک و نفاق مرتے ہی راحتیں چھین لیتا ہے جس طرح آگ کا بجھ جانا روشنی دور کر دیتا ہے۔ حضرت قتادہؒ کا قول ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے منافق کو دنیوی نفع مثلاً مسلمانوں میں لڑکے لڑکی کا لین دین ورثہ کی تقسیم جان و مال کی حفاظت وغیرہ مل جاتی ہے، لیکن چونکہ اس کے دل میں ایمان، اور اس کے کاموں میں سچائی نہیں ہوتی اس لئے موت کے وقت وہ سب منافع سلب ہو جاتے ہیں جیسے آگ کی روشنی جو بجھ جائے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں اندھیریوں میں چھوڑ دینا مرنے کے بعد عذاب ہوتا ہے۔ یہ لوگ حق کو دیکھتے ہیں، زبان سے کہتے ہیں اور ظلمت کفر سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن پھر اپنے کفر و نفاق کی وجہ سے ہدایت اور حق پر قائم رہنا ان سے چھین جاتا ہے۔ سدیؒ کا قول ہے کہ اندھیرے سے مراد ان کا نفاق ہے حسن بصریؒ فرماتے ہیں موت کے وقت منافق کی بداعمالیاں اندھیروں کی طرح اس پر چھا جاتی ہیں اور کوئی بھلائی کی روشنی اس کے لئے باقی نہیں رہتی جس سے اس کی توحید کی تصدیق ہو۔ وہ بہرے ہیں حق کے سننے سے، اندھے ہیں راہ راست کو دیکھنے اور سمجھنے سے ہدایت کی طرف

لوٹ نہیں سکتے- نہ تو انھیں توبہ نصیب ہوتی ہے نہ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں-

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيٓ اٰذَانِهِمْ

یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے بارش ہو آسمان کی طرف سے اسمیں آندھی بھی ہو اور رعد و برق بھی ہو' جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں

مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۗ وَاللّٰهُ مُحِيطٌۢ بِالْكٰفِرِينَ ⑲ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ

اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشہ موت سے اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لئے ہوئے ہیں کافروں کو- برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی

أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ ۙ وَإِذَآ أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ

انکی بینائی اس نے لی، جہاں ذرا ان کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کیا اور جب ان پر تاریکی ہوتی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ ارادہ

شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ⑳

کرتے تو ان کے گوش و چشم سب سلب کر لیتے بلاشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں ......

یہ دوسری مثال ہے جو دوسرے قسم کے منافقوں کیلئے بیان کیگئی ہے یہ وہ قوم ہے جن پر کبھی حق ظاہر ہو جاتا ہے اور کبھی پھر شک میں پڑ جاتے ہیں- تو شک کے وقت ان کی مثال برسات کی سی ہے- صَیِّبٌ کے معنی مینھ اور بارش کے ہیں- بعض نے بادل کے معنی بھی بیان کئے ہیں لیکن زیادہ مشہور معنی بارش کے ہی ہیں جو اندھیرے میں سے برسے ظلمات سے مراد شک اور کفر و نفاق ہے اور رعد یعنی گرج جو اپنی خوفناک آواز سے دل دہلا دیتی ہے یہی حال منافق کا ہے کہ اسے ہر وقت ڈر خوف گھبراہٹ اور پریشانی ہی رہتی ہے- جیسے اور جگہ ہے يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ یعنی ہر آواز کو اپنے اوپر ہی سمجھتے ہیں- اور جگہ ارشاد ہے کہ یہ منافقین خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں، لیکن دراصل وہ ڈرپوک لوگ ہیں اگر وہ کوئی جائے پناہ یا راستہ پالیں تو یقیناً وہ اس میں سمٹ کر گھس جائیں- بجلی سے مثال دی ہے اس نور ایمان کی جو ان کے دلوں میں کسی وقت چمک اٹھتا ہے تو وہ اس وقت اپنی انگلیاں موت کے ڈر سے کانوں میں ڈال لیتے ہیں' لیکن یہ انھیں کوئی نفع نہ دے گا- یہ خدائے تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کے ارادے کے ماتحت ہیں یہ بچ نہیں سکتے جیسے اور جگہ فرمایا هَلْ اَتٰىكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ الخ کیا تمہیں لشکریوں کی فرعونیوں اور ثمودیوں کی روایتیں نہیں پہنچیں- پہنچی تو ہیں لیکن ...... ان کافروں کو سوائے جھٹلانے کے اور کوئی کام نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ بھی انھیں ان کے پیچھے سے گھیر رہا ہے- بجلی کا آنکھوں کو اچک لینا اسکی قوت اور سختی اور ان منافقین کی بینائی کی کمزوری ...... ان کا ضعف ایمان ہے- حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں- مطلب یہ ہے کہ قرآن کی مضبوط آیتیں ان منافقوں کی قلعی کھول دیں گی اور ان کے چھپے ہوئے عیوب ظاہر کر دیں گی اور اپنی نورانیت سے انھیں مبہوت کر دیں گی- جب ان پر اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی ایمان جب ان پر ظاہر ہو جاتا ہے تو ذرا روشن دل ہو کر پیروی بھی کرنے لگتے ہیں' لیکن پھر جہاں شک و شبہ آیا کہ دل میں کدورت اور ظلمت بھر گئی اور بھونچکے ہو کر کھڑے رہ گئے اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اسلام کا ذرا عروج ملا تو ان کے دل میں قدرے اطمینان پیدا ہوا لیکن جہاں اس کے خلاف نظر آیا تو یہ الٹے پیروں کفر کی طرف لوٹنے لگے- جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ الخ یعنی بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کنارے پر کھڑے کھڑے خدا کی عبادت کرتے ہیں اگر بھلائی ملی تو مطمئن ہوئے اور اگر برائی پہنچی تو اسی وقت پھر گئے' الخ حضرت ابن عباس یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان کا روشنی میں چلنا حق کو جان کر کلمۂ اسلام پڑھنا ہے اور اندھیرے میں ٹھیر جانا کفر کی طرف لوٹ جانا ہے- اور بھی بہت سے مفسرین کا یہی قول ہے اور زیادہ صحیح اور ظاہر بھی یہی قول ہے- واللہ اعلم-

روز قیامت میں بھی ان کا یہی حال رہے گا کہ جب لوگوں کو ان کے ایمان کے اندازے کے مطابق نور ملے گا بعض کو کمی کئی میلوں تک کا بعض کو اس سے بھی زیادہ کسی کو اس سے کم یہاں تک کہ کسی کو اتنا نور ملے گا کہ کبھی روشن ہوا اور کبھی اندھیرا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ذرا سی دور چل سکیں گے پھر ٹھیر جائیں گے پھر ذرا سی دور کا نور ملے گا پھر بجھ جائے گا اور بعض وہ بے نصیب بھی ہوں گے کہ ان کا نور بالکل بجھ جائے گا یہ پورے منافق ہوں گے جن کے بارے میں فرمان خداوندی ہے یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا الخ یعنی جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں کو پکاریں گی اور کہیں گی کہ ذرا رکو ہمیں بھی آ لینے دو تاکہ ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں تو کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور نور ڈھونڈ لاؤ الخ اور مومنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُھُمْ الخ یعنی اس دن تو دیکھے گا کہ مومن مرد و عورتوں کے آگے آگے اور دائیں جانب نور ہوگا۔ اور کہا جائے گا کہ تمہیں آج کے دن جنتوں کی خوشخبریاں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور فرمایا جس دن نہ رسوا کریگا اللہ تعالیٰ نبی کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے ان کا نور ان کے آگے اور دائیں ہوگا وہ کہہ رہے ہوں گے اے ہمارے رب ہمارے لئے ہمارا نور پورا کر اور ہمیں بخش یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے' ان آیتوں کے بعد اب اس مضمون کی احادیث بھی قابل غور ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں بعض مومنوں کو مدینہ سے لے کر عدن تک نور ملے گا' بعض کو اس سے کم' یہاں تک بعض کو اتنا کم کہ صرف پاؤں رکھنے کی جگہ ہی روشن ہوتی ہوگی (ابن جریر) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں' ایمان والوں کو انکے اعمال کیمطابق نور ملے گا بعض کو کھجور کے درخت جتنا کسی کو قد آدم جتنا کسی کو صرف اتنا ہی کہ اس کا انگوٹھا ہی روشن ہو کبھی بجھ جاتا ہو کبھی روشن ہو جاتا ہو (ابن ابی حاتم) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں انھیں نور ملے گا ان کے اعمال کے مطابق جسکی روشنی میں وہ پل صراط سے گذریں گے بعض لوگوں کا نور پہاڑ جتنا ہوگا بعضوں کا کھجور جتنا اور سب سے کم نور والا وہ ہوگا جس کا نور اس کے انگوٹھے پر ہوگا کبھی چمک اٹھے گا اور کبھی بجھ جائے گا (ابن ابی حاتم) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سب توحید والوں کو قیامت کے دن نور ملے گا۔ جب منافقوں کا نور بجھ جائے گا تو موحد ڈر کر کہیں گے رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا خدایا ہمارے نور کو پورا کر (ابن ابی حاتم) ضحاک بن مزاحمؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ قیامت والے دن لوگ کئی قسم کے ہوں گے خالص مومن جن کا بیان اگلی چار آیتوں میں ہوا۔ خالص کفار جن کا بیان اس کے بعد کی دو آیتوں میں ہے اور منافق جنکی دو قسمیں ہیں ایک تو خالص منافق جن کی مثال آگ کی روشنی سے دی گئی۔ دوسرے وہ منافق جو تردد میں ہیں کبھی تو ایمان چمک اٹھتا ہے۔ کبھی بجھ جاتا ہے ان ہی کی مثال بارش سے دی گئی ہے۔ یہ پہلے قسم کے منافقوں سے کچھ کم ہیں ٹھیک اسی طرح سورۂ نور میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومن کی اور اس کے دل کے نور کی مثال اس منور چراغ سے دی ہے جو روشن فانوس میں ہو اور خود فانوس بھی چمکتے ہوئے تارے کی طرح ہو چنانچہ ایمان دار کا ایک تو خود دل روشن دوسرے خالص شریعت کی اسے امداد پس روشنی پر روشنی نور بالائے نور ہو جاتا ہے اسی طرح دوسری جگہ کافروں کی مثال بھی بیان کی جو اپنی نادانی کی وجہ اپنے تئیں کچھ سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ کچھ نہیں ہوتے فرمایا وہ کافروں کے اعمال کی مثال سراب کی طرح ہے جیسے پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ پاس آ کر دیکھتا ہے لیکن کچھ بھی نہیں پاتا۔ پھر اور موقع پر ان جاہل کافروں کی مثال بیان کی جو جہل بسیط میں مبتلا ہیں۔ فرمایا مانند سخت اندھیریوں کے جو گہرے سمندر میں ہوں جو موجوں پر موجیں مار رہا ہو پھر ابر سے ڈھکا ہوا ہو اور اندھیرے چھائے ہوں ہاتھ نکالے تو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کے لئے خدا کی طرف سے نور نہ ہو اس کے پاس نور کہاں سے آئے؟ پس کفار کی بھی دو قسمیں کیں' ایک تو دوسرے کو کفر کی طرف بلانے والے دوسرے ان کی تقلید کرنے والے جیسے سورۂ حج کے شروع میں ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ الخ بعض وہ لوگ ہیں جو خدا کے بارے میں علم بغیر جھگڑتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں اور جگہ فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا ھُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ بعض علم اور ہدایت اور روشن کتاب بغیر خدا کے بارے میں لڑتے جھگڑتے ہیں

سورۂ واقعہ کے شروع میں اور آخر میں سورۃ النساء میں مومنوں کی بھی دو ۲ قسمیں بیان کی ہیں سابقین اور اصحاب یمین۔ یعنی مقرب بارگاہ خداوندی اور پرہیزگار و نیک کار لوگ۔ پس ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ مومنوں کی دو جماعتیں ہیں۔ مقرب اور ابرار۔ اور کافروں کی بھی دو قسمیں ہیں، کفر کی طرف بلانے والے اور ان کی تقلید کرنے والے اور منافقوں کی بھی دو قسمیں ہیں، خالص اور پکے منافق اور وہ منافق جن میں نفاق کی ایک آدھ شاخ ہے۔ صحیحین میں حدیث ہے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین خصلتیں ہیں جس میں تینوں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ایک ہو اس میں ایک خصلت نفاق کی ہے جب تک اسے نہ چھوڑے۔ بات کرنے میں جھوٹ بولنا۔ وعدہ خلافی کرنا۔ امانت میں خیانت کرنا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسان میں کبھی نفاق کا کچھ حصہ ہوتا ہے خواہ وہ نفاق عملی ہو خواہ اعتقادی جیسا کہ آیت و حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ سلف کی ایک جماعت اور علماءِ کرام کے ایک گروہ کا یہی مذہب ہے۔ اس کا بیان پہلے بھی گذر چکا ہے اور آئندہ بھی آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دل چار قسم کے ہیں ایک تو صاف دل جو روشن چراغ کی طرح چمک رہا ہو دوسرے وہ دل جو غلاف آلود ہیں تیسرے وہ دل جو اُلٹے ہیں چوتھے وہ دل جو مخلوط ہیں۔ پہلا دل تو مومن کا ہے جو پوری طرح نورانی ہے۔ دوسرا کافر کا دل ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں تیسرا دل خالص منافقوں کا ہے جو جانتا ہے اور انکار کرتا ہے۔ چوتھا دل اس منافق کا ہے جسمیں ایمان و نفاق دونوں جمع ہیں۔ ایمان کی مثال اس سبزے کی طرح ہے جو پاکیزہ پانی سے بڑھ رہا ہو اور نفاق کی مثال اس پھوڑے کی طرح ہے جسمیں پیپ اور خون بڑھتا ہی جاتا ہو۔ اب جو مادہ بڑھ جائے وہ دوسرے پر غالب آجاتا ہے، یہ حدیث سند کے اعتبار سے بہت بہت قوی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ اگر خدا چاہے تو ان کے کان اور آنکھیں برباد کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے حق جان کر اسے چھوڑ دیا تو خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی اگر چاہے تو عذاب و سزا کرے اگر چاہے معاف کر دے۔ یہاں قدرت کا بیان اسلئے کیا کہ پہلے منافقوں کو اپنے عذاب اور اپنی جبروت سے ڈرایا ہے اور کہہ دیا کہ وہ انھیں گھیر لینے پر قادر ہے۔ قدیر کے معنی قادر کے ہیں جیسے علیم کے معنی عالم کے ہیں۔ امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں یہ دو مثالیں ایک ہی قسم کے منافقین کی ہیں اَوْ معنی میں وَ کے ہے۔ یعنی اور جیسے فرمایا لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ۝ یا لفظ اَوْ تخییر یعنی اختیار کے لئے ہے یعنی خواہ یہ مثال بیان کرو خواہ وہ مثال بیان کرو اختیار ہے۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں اَوْ یہاں پر تساوی یعنی برابری کے لئے ہے جیسے عربی زبان کا محاورہ ہے جَالِسِ الْحَسَنَ اَوِ ابْنَ سِيْرِيْنَ زمخشری بھی توجیہ کرتے ہیں تو مطلب یہ ہو گا کہ ان دونوں مثالوں میں سے جونسی مثال چاہو بیان کرو دونوں ان کے حال کے مطابق ہیں لیکن ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ باعتبار منافقوں کی قسموں کے ہے ان کے احوال و صفات طرح طرح کے ہیں جیسا کہ سورۂ برات میں وَمِنْهُمْ وَمِنْهُمْ وَمِنْهُمْ کر کے ان کی بہت سی قسمیں بہت سے افعال اور بہت سے اقوال بیان کئے ہیں تو یہ دونوں مثالیں دو قسم کے منافقوں کی ہیں جو ان کے احوال اور صفات سے بالکل مشابہ ہیں واللہ اعلم۔ جیسے کہ سورۂ نور میں دو قسم کے کفار کی مثالیں بیان کیں ایک کفر کی طرف بلانے والے دوسرے مقلد۔ فرمایا وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ پھر فرمایا اَوْ كَظُلُمٰتٍ پس پہلی مثال یعنی ریت کے تودے کی کفر کی طرف بلانے والوں کی ہے جو جہل مرکب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دوسری مثال مقلدوں کی ہے جو جہل بسیط میں مبتلا ہیں۔ واللہ اعلم

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ ﴿۲۱﴾

اے لوگو عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تمکو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی کہ تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ وہ ذات پاک

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ

ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین اور آسمان کو چھت اور برسایا آسمان سے پانی پھر پردۂ عدم سے نکالا . . . . . .

بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

بذریعہ اس پانی کے پھلوں کی غذا کو تم لوگوں کے واسطے اب تو مت ٹھیراؤ اللہ پاک کے مقابل اور تم جانتے بوجھتے ہو

یہاں سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی اُلوہیت کا بیان شروع ہوتا ہے وہی اپنے بندوں کو عدم سے وجود میں لایا اُسی نے ہر طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا فرمائیں اسی نے زمین کا فرش بنایا اور اس میں مضبوط پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں اور آسمان کو چھت بنایا۔ جیسے دوسری آیت میں آیا وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا الخ یعنی آسمان کو محفوظ چھت بنایا باوجود اس کے وہ نشانیوں سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ پانی آسمان سے اتارنے کا مطلب بادل سے نازل فرمانا ہے اس وقت جبکہ لوگ اُس کے پورے محتاج ہوں پھر اس پانی سے طرح طرح کے پھل پھول پیدا کرتا ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور ان کے جانور بھی۔ جیسے قرآن مجید میں جابجا اس کا بیان آیا ہے۔ ایک جگہ فرمان ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا الخ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہیں پیاری پیاری صورتیں عطا فرمائیں اور بھلی بھلی روزیاں پہنچائیں یہی اللہ ہے جو برکتوں والا اور تمام عالم کو پالنے والا ہے۔ پس سب کا خالق، سب کا رازق، سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اسی وجہ سے وہی مستحق ہے ہر قسم کی عبادتوں کا اور شریک نہ کئے جانے کا اسی لیئے فرمایا اللہ تعالیٰ کے شریک نہ ٹھیراؤ، حالانکہ تم جانتے ہو۔ صحیحین میں حدیث ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پوچھتے ہیں حضور سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو خالق ہے۔ شریک ٹھیرانا۔ حضرت معاذ رضہ والی حدیث میں ہے کیا جانتے ہو کہ خدا کا حق بندوں پر کیا ہے؟ یہ کہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کریں۔ دوسری حدیث میں ہے تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ جو خدا چاہے اور فلاں چاہے، بلکہ یوں کہے کہ جو کچھ اللہ اکیلا چاہے پھر جو فلاں چاہے۔ طفیل بن سنجرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سوتیلے بھائی فرماتے ہیں، میں نے خواب میں چند یہودیوں کو دیکھا میں نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہم یہودی ہیں۔ میں نے کہا افسوس تم میں یہ بڑی خرابی ہے کہ تم حضرت عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ انہوں نے کہا تم بھی اچھے لوگ ہو، لیکن افسوس تم کہتے ہو جو خدا چاہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہیں۔ پھر میں نصرانیوں کی جماعت کے پاس گیا اور ان سے بھی اسی طرح پوچھا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ میں نے ان سے کہا افسوس تم بھی مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا جانتے ہو۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ میں نے صبح اپنے اس خواب کا ذکر لوگوں سے کیا پھر دربار نبوی میں حاضر ہو کر آپ سے بھی واقعہ بیان کیا آپ نے پوچھا کیا کسی اور سے بھی تم نے اس خواب کا ذکر کیا؟ میں نے کہا ہاں حضور۔ اب آپ کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا طفیل رضہ نے ایک خواب دیکھا اور تم میں سے بعض سے بیان بھی کیا میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس کلمہ کے کہنے سے روک دوں، لیکن فلاں فلاں کاموں کی وجہ سے میں اب تک نہ کہہ سکا۔ یاد رکھو اب ہرگز ہرگز "خدا چاہے اور اس کا رسول" کبھی نہ کہنا، بلکہ یوں کہو کہ صرف اللہ تعالیٰ اکیلا جو چاہے (ابن مردویہ) ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھیراتا ہے، جو اللہ تعالیٰ اکیلا چاہے (ابن مردویہ) یہ تمام کلمات توحید کے سراسر خلاف ہیں توحید باری کے لیے یہ سب احادیث بیان ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم۔ تمام کفار اور منافقوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا اور فرمایا اللہ کی عبادت کرو یعنی اس کی توحید کے پابند بن جاؤ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو جو نہ نفع دے سکے نہ نقصان پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں جو تمہیں روزی پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اس توحید کی طرف بلا رہے ہیں جس کے حق اور سچ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ شرک اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جیسے چیونٹی جو رات کے اندھیرے میں کسی صاف پتھر پر چل رہی ہو۔ انسان کا یہ کہنا کہ قسم ہے اللہ کی اور قسم ہے آپ کی حیات کی یہ بھی شرک ہے۔ انسان کا یہ کہنا کہ اگر یہ کتیا نہ ہوتی تو چور رات کو ہمارے گھر میں گھس آتے، یہ بھی شرک ہے۔ آدمی کا یہ قول کہ اگر بطخ گھر میں نہ ہوتی

تو چوری ہو جاتی ۔ یہ بھی شرک کا کلمہ ہے ۔ کسی کا یہ قول کہ جو اللہ چاہے اور آپ ۔ یہ بھی شرک ہے ۔ کسی کا یہ کہنا کہ اگر اللہ نہ ہوتا اور نہ فلاں نہ ہوتا ۔ یہ سب کلمات شرک ہیں ۔ صحیح حدیث میں ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں ۔ تو آپ نے فرمایا کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھیراتا ہے ؟ دوسری حدیث میں ہے ، تم اچھے لوگ ہو اگر تم شرک نہ کرتے ۔ تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے ۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں اَندَاد کے معنی شریک اور برابر کے ہیں ۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں تم توراۃ و انجیل پڑھتے ہو اور جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایک اور بے شریک ہے پھر جانتے ہوئے کیوں اللہ تعالیٰ کا شریک کرتے ہو ؟ مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ عزوجل نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ چیزوں کا حکم دیا کہ ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو ۔ قریب تھا کہ وہ اس میں ڈھیل کریں تو حضرت عیسیٰ السلام نے انہیں یاد دلایا کہ آپ کو پروردگار عالم کا حکم تھا ان پانچ چیزوں پر خود کاربند ہو کر دوسروں کو بھی حکم دو ۔ پس یا تو خود آپ کہہ دیجئے یا میں پہنچا دوں حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ سبقت کر گئے تو کہیں مجھے عذاب نہ کیا جائے ۔ یا زمین میں دھنسا نہ دیا جائے ۔ پس یحییٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی مسجد میں جمع کیا ۔ جب مسجد پر ہو گئی تو اونچی جگہ پر بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کر کے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم کیا ہے کہ خود عمل کر کے تم سے بھی ان پر عمل کراؤں ۔ ایک یہ کہ اللہ ایک کی عبادت کرو ۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص خاص اپنے مال سے کسی غلام کو خریدے غلام کام کاج کرے اور جو کچھ پائے اُسے کسی اور کو دیدے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو ؟ ٹھیک اسی طرح تمہارا پیدا کرنے والا تمہیں روزیاں دینے والا تمہارا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہی ہے پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ ۔ دوسری یہ کہ نماز کو ادا کیا کرو اللہ تعالیٰ بندے کے منہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے جبتک کہ وہ نماز میں ادھر اُدھر التفات نہ کرے جب تم نماز میں ہو تو خبردار ادھر اُدھر التفات نہ کرنا ۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ روزے رکھا کرو ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس مشک کی تھیلی بھری ہوئی ہو جس سے اس کے تمام ساتھیوں کے دماغ معطر رہیں یاد رکھو روزے دار کی منہ کی خوشبو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسند ہے ۔ چوتھا حکم اس کا یہ ہے کہ صدقہ دیتے رہا کرو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو دشمنوں نے قید کر لیا اور گردن کیساتھ اسکے ہاتھ باندھ دیئے اور گردن مارنے کیلئے لے چلے تو کہنے لگا کہ تم مجھ سے فدیہ لے لو اور مجھے چھوڑ دو ۔ چنانچہ جو کچھ تھا کم زیادہ دے دلا کر اپنی جان چھڑالی پانچواں حکم اس کا یہ ہے کہ بکثرت اس کے نام کا وظیفہ اور اس کا ذکر کیا کرو ۔ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کے پیچھے تیزی کے ساتھ دشمن دوڑا آتا ہے اور وہ ایک مضبوط قلعہ میں گھس جاتا ہے اور وہاں امن و امان پالیتا ہے ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت شیطان سے بچا ہوا ہوتا ہے ۔ یہ فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب میں بھی تمہیں پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا حکم جناب باری نے مجھے دیا ہے مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑے رہنا ۔ اللہ اور اس کے رسول اور مسلمان حاکم وقت کے احکام سننا اور ماننا ۔ ہجرت کرنا اور جہاد کرنا ۔ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھی نکل گیا اس نے اسلام کے پٹے کو اپنے گلے سے اتار پھینکا ۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ رجوع کر لے جو شخص جاہلیت کی پکار پکارے وہ جہنم کا کوڑا کرکٹ ہے ۔ لوگوں نے کہا حضور اگرچہ وہ روزے دار اور نمازی ہو ؟ فرمایا اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو ۔ مسلمانوں کو ان کے ان ناموں کے ساتھ پکارتے رہو جو خود خداوند تبارک و تعالیٰ نے رکھے ہیں مسلمین مؤمنین اور عباد اللہ ۔ یہ حدیث حسن ہے ۔ اس آیت میں بھی یہی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے وہی تمہیں روزیاں دیتا ہے ۔ پس عبادت بھی اسی کی کرو ۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عبادت میں توحید باری تعالیٰ کا پورا خیال رکھنا چاہیے کہ کسی اور کی عبادت نہ کرے ۔ جملہ عبادتوں کے لائق صرف وہی ہے ۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کی وجود پر بھی اس آیت سے استدلال کیا ہے اور فی الواقع یہ آیت بہت بڑی دلیل ہے اللہ تعالیٰ کے وجود پر ۔ زمین اور آسمان کی مختلف شکل و صورت ، مختلف رنگ ، مختلف مزاج اور مختلف نفع کی موجودات ان میں سے ہر ایک کا نفع والا ہونا اور خاص حکمت سے ہونا ثبوت ہے ۔ ان کے خالق کے وجود کا اس کی عظیم الشان قدرت اور حکمت اور زبردست سطوت اور سلطنت کا ۔

کسی بدوی سے پوچھا گیا کہ اللہ تبارک تعالیٰ کے ہونے پر کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا یا سُبْحَانَ اللہِ اِنَّ الْبَعْرَ لَيَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ ۝ وَاِنَّ آثَارَ الْاَقْدَامِ لَتَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْرِ ۝ فَسَمَآءٌ ذَاتُ اَبْرَاجٍ ۝ وَاَرْضٌ ذَاتُ فِجَاجٍ ۝ وَبِحَارٌ ذَاتُ اَمْوَاجٍ ۝ اَلَا يَدُلُّ ذَالِكَ عَلٰى وُجُوْدِ اللَّطِيْفِ الْخَبِيْرِ ۝ یعنی مینگنی سے اونٹ معلوم ہو سکے اور پاؤں کے نشان کو زمین پر دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ کوئی آدمی گیا ہے تو کیا یہ برجوں والا آسمان یہ راستوں والی زمین یہ موجیں مارنے والے سمندر اللہ تعالیٰ باریک بین اور خبردار کے وجود پر دلیل نہیں بن سکتے؟ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ہارون رشید نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر کیا دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا زبان کا مختلف ہونا' آوازوں کا جداگانہ ہونا نغموں کا الگ ہونا ثابت کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی سوال ہوتا ہے تو آپ جواب دیتے ہیں کہ چھوڑو میں ابھی کسی اور سوچ میں ہوں۔ لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک بہت بڑی کشتی جس میں طرح طرح کی تجارتی چیزیں ہیں نہ کوئی اس کا نگہبان ہے نہ چلانے والا ہے باوداس کے وہ برابر آ جا رہی ہے اور بڑی بڑی موجوں کو خود بخود چیرتی پھاڑتی گذر جاتی ہے۔ ٹھیرنے کی جگہ پر ٹھیر جاتی ہے چلنے کی جگہ پر چلتی رہتی ہے اور نہ کوئی ملاح ہے نہ منتظم' سوال کرنے والے دہریوں نے کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے کوئی عاقل ایسی بات کہہ سکتا ہے کہ اتنی بڑی کشتی نظام کے ساتھ تلاطم والے سمندر میں آئے جائے اور کوئی اس کا چلانے والا نہ ہو؟ آپ نے فرمایا افسوس تمہاری عقلوں پر ایک کشتی تو بغیر چلانے والے کے نہ چل سکے لیکن یہ ساری دنیا آسمان و زمین کی سب چیزیں ٹھیک اپنے کام پر لگی رہیں اور ان کا مالک حاکم خالق کوئی نہ ہو؟ یہ جواب سن کر وہ لوگ ہکے بکے ہو گئے اور حق معلوم کر کے مسلمان ہو گئے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ توت کے پتے ایک ہی ہیں اور ایک ہی ذائقہ کے ہیں۔ ان کو کیڑے' شہد کی مکھی اور گائیں بکریاں' ہرن وغیرہ سب کھاتے اور چرتے ہیں۔ اسی کو کھا کر کیڑے سے ریشم نکلتا ہے۔ مکھی شہد دیتی ہے ہرن میں مشک پیدا ہوتا ہے اور گائیں بکریاں مینگنیاں دیتی ہیں۔ کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں کہ ایک پتے میں یہ مختلف خواص پیدا کرنے والا کوئی ہے؟ اور ہم اسی کو اللہ تبارک تعالیٰ مانتے ہیں وہی موجد اور صانع ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک مرتبہ وجود باری تعالیٰ پر دلیل طلب کی جاتی ہے تو آپ فرماتے ہیں۔ سنو! یہاں ایک نہایت مضبوط قلعہ ہے جس میں کوئی دروازہ نہیں نہ کوئی راستہ ہے' بلکہ سوراخ تک نہیں باہر سے چاندی کی طرح چمک رہا ہے اور اندر سے سونے کی طرح دمک رہا ہے اور اوپر نیچے دائیں بائیں چاروں طرف سے بالکل بند ہے ہوا تک اس میں نہیں جا سکتی اچانک اسکی ایک دیوار گرتی ہے اور ایک آنکھوں کانوں والا بولتا چالتا خوبصورت شکل اور پیاری بولی والا چلتا پھرتا جاندار نکل آتا ہے۔ کہو اس بند اور محفوظ مکان میں سے اسے پیدا کرنے والا کوئی ہے یا نہیں انسانی ہستیوں سے بالاتر اور اس کی قدرت غیر محدود ہے یا نہیں؟ مطلب آپ کا یہ تھا کہ انڈے کو دیکھو چاروں طرف سے بند ہے پھر اس میں پروردگار خالق یکتا جاندار بچہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی دلیل ہے خدا کے وجود پر اور اسکی توحید پر۔ حضرت ابونواس رحمۃ اللہ علیہ سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا آسمان سے بارش کا برسانا اور اس سے درختوں کا پیدا ہونا اور ان ہری ہری شاخوں پر خوش ذائقہ میووں کا لگنا ہی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی کافی دلیل ہے۔ ابن معتز فرماتے ہیں افسوس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی ذات کے جھٹلانے پر لوگ کیسی دلیری دکھاتے ہیں۔ حالانکہ ہر ہر چیز اس پروردگار کی ہستی اور لاشریک ہونے پر گواہ ہے۔ اور بزرگوں کا مقولہ ہے کہ آسمانوں کو دیکھو ان کی بلندی ان کی وسعت' ان کے چھوٹے بڑے چمکیلے اور روشن ستاروں پر نظریں ڈالو ان کے چمکنے دمکنے ان کے چلنے پھرنے اور ٹھیر جانے' ظاہر ہونے اور چھپ جانے کا مطالعہ کرو' پھر سمندروں کو دیکھو جو موجیں مارتے ہوئے زمین کو گھیرے ہوئے ہیں' پھر اونچے نیچے مضبوط پہاڑوں کو دیکھو جو زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور اسے ہلنے نہیں دیتے جن کے رنگ' جن کی صورتیں مختلف ہیں۔ پھر قسم قسم کی اور مخلوقات پر نظر ڈالو پھر ادھر سے ادھر جاتے والی کھیتیوں اور باغوں کو شاداب کرنے والی

خوشنما نہروں کو دیکھو کھیتوں اور باغوں کی سبزی اور ان کے طرح طرح کے پھل پھول مزے مزے کے میووں پر غور کرو زمین ایک پانی ایک لیکن شکلیں صورتیں اور خوشبوئیں رنگت ذائقہ فائدہ الگ الگ ۔ کیا یہ تمام مصنوعات تمہیں نہیں بتاتیں کہ ان کا صانع کوئی ہے؟ کیا یہ تمام موجودات با آواز بلند نہیں کہہ رہی ہیں کہ ان کا موجد کوئی ہے؟ کیا یہ ساری مخلوق اپنے خالق کی ہستی اسکی ذات اور اس کی توحید پر دلالت نہیں کرتی؟ یہ ہیں روزگار دلائل جو خداوند جل وعلا نے اپنی ذات کے منوانے کے لئے ہر نگاہ کے سامنے کر رکھے ہیں جو اسکی زبردست قدرتوں اور اسکی پر روز حکمتوں اور اسکی لاثانی رحمتوں اس کے بے نظیر انعاموں اس کے لازوال احسانوں پر دلالت کرنے کے لئے کافی وافی ہیں ۔ ہمارا اقرار ہے کہ اس کے سوا نہ کوئی پالنے پوسنے والا نہ اسکے سوا کوئی پیدا کرنے اور حفاظت کرنے والا نہ اسکے سوا کوئی معبود برحق نہ اس کے سوا کوئی مسجود لاشک ۔ ہاں دنیا کے لوگو! سن رکھو میرا توکل اور بھروسہ اسی پر ہے میری انابت اور التجا اسی کی طرف ہے میرا جھکنا اور پست ہونا اسی کے سامنے ہے ۔ میری تمناؤں کا مرکز میری امیدوں کا آسرا میرا ماوی اور ملجا وہی ایک ہے اسی کے دست رحمت کو تکتا ہوں اور اسی کا نام جپتا ہوں ۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ

اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندۂ خاص پر تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو اور بلا لو اپنے حمایتیوں

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا

کو جو خدا سے الگ (تجویز کر رکھے) ہیں ۔ اگر تم سچے ہو . . . . . . . پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکے اور قیامت تک بھی نہ کر سکو گے تو پھر ذرا بچتے رہیو ۔

النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ○

دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں ۔ تیار ہوئی رکھی ہے کافروں کے واسطے ۔

توحید کے بیان کے بعد اب نبوت کی تصدیق بیان ہو رہی ہے ۔ کفار کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے جو قرآن پاک اپنے بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہے اسے اگر تم ہمارا کلام نہیں مانتے تو تم اور تمہارے مددگار سب ملکر پورا قرآن، تو نہیں صرف ایک سورت تو اس جیسی بنا لاؤ ۔ جب تم اسے نہیں کر سکتے اور اس سے عاجز ہو تو پھر اس قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کیوں شک کرتے ہو؟ شُهَدَآءَ سے مراد مددگار اور شریک ہیں جو ان کی مدد اور موافقت کیا کرتے تھے ۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جنھیں تم نے اپنا معبود بنا رکھا ہے انھیں بھی بلا لو اور ان سے بھی مدد چاہو پھر اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ ۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ تم اپنے حاکموں اور اپنے زباں داں فصیح و بلیغ لوگوں سے بھی امداد لے لو ۔ قرآن پاک کے اس معجزے کا اظہار اور اس طرح کا کلام کئی جگہ ہے ۔ سورۂ قصص میں ہے فَأْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ أَهْدٰى مِنْهُمَآ أَتَّبِعْهُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ اگر تم سچے ہو تو ان دونوں سے (یعنی توریت و قرآن سے) زیادہ ہدایت والی کوئی اور خدائی کتاب لاؤ تو میں بھی اس کی تابعداری کروں گا ۔ سورۂ سبحان میں فرمایا قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى أَنْ يَّأْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○ یعنی اگر تمام جنات اور انسان جمع ہو کر اور ہر ایک دوسرے کی مدد کر کے یہ چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنائیں تو بھی ان کے امکان میں نہیں ۔ سورۂ ہود میں فرمایا أَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۖ قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ یعنی کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس قرآن کو خود اس پیغمبر نے گھڑ لیا تم کہو کہ اگر تم سچے ہو تو تم سب مل کر اور خدا کے سوا جنھیں تم بلا سکتے ہو بلا کر اس جیسی دس سورتیں تو بنا لاؤ

سورہ یونس میں ہے۔ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ یعنی یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے گھڑا ہوا نہیں، بلکہ یہ اگلی کتابوں کو سچا بتانے والا اور کتاب کی تفصیل ہے جس کے خدائی کلام ہونے میں کوئی شک نہیں جو ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ اسے خود ساختہ بناتے ہیں ان سے کہو کہ اللہ کے سوا ہر شخص کو بلا کر (اس قرآن کی سیکڑوں سورتوں میں سے) ایک چھوٹی سی سورت جیسی کوئی سورت تو بنا لاؤ تاکہ تمہارا سچ ظاہر ہو۔ یہ تمام آیتیں تو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور اہل مکہ کو اس کے مقابلہ میں عاجز ثابت کر کے پھر مدینہ شریف میں بھی اس مضمون کو دہرایا گیا جیسے اوپر کی آیت۔ مِثْلِهٖ کی ضمیر کو بعض نے تو قرآن کی طرف لوٹایا ہے۔ یعنی کوئی سورت اس جیسی بنا لاؤ۔ بعض نے یہ ضمیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹائی ہے۔ یعنی آپ جیسا کوئی اُمّی ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ باوجود کچھ پڑھا ہوا نہ ہونے کے وہ کلام کہے جس کا مثل کسی سے نہ بن سکے۔ لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ مجاہدؒ، قتادہ، عمرو بن مسعودؓ، ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور اکثر محققین کا یہی قول ہے۔ امام ابن جریر طبریؒ، زمخشریؒ، رازیؒ نے بھی اس قول کو پسند کیا ہے۔ اس کی ترجیح کی بہت سی وجہیں ہیں ایک اس میں سب کو ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ جمع کر کے بھی اور الگ الگ بھی، خواہ وہ اُمّی اور ان پڑھ ہوں، خواہ اہل کتاب اور پڑھے لکھے لوگ ہوں اس میں اس معجزے کا کمال ہے اور یہ نسبت اس کے صرف ان پڑھ لوگوں کو عاجز کیا جائے اس میں زیادہ مبالغہ ہے۔ پھر دس سورتوں کا مطالبہ کرنا اور اس کے مثل نہ لا سکنے کی پیش گوئی کرنا بھی اسی کو ثابت کرتا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پس اس عام اعلان سے جو بار بار کیا گیا اور ساتھ ہی پیشین گوئی بھی کر دی گئی کہ یہ لوگ اس پر قادر نہیں مکہ میں اور مدینہ میں بارہا اس کا اعادہ کیا گیا اور وہ لوگ جن کی مادری زبان عربی تھی جنہیں اپنی فصاحت اور بلاغت پر ناز تھا جو لوگ آپ کی اور آپ کے دین پر خار کھائے ..... بیٹھے ہوئے تھے وہ در حقیقت اس سے عاجز آ گئے نہ پورے قرآن کا جواب دے سکے نہ دس سورتوں کا، بلکہ نہ ایک سورت کا۔ پس ایک معجزہ تو یہ کہ اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی وہ نہ بنا سکے

### دوسرا معجزہ

دوسرا معجزہ یہ کہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی کہ یہ ہرگز اس جیسا نہیں بنا سکنے گو سب جمع ہو جائیں اور قیامت تک محنت کریں۔ پس ایسا ہی ہوا نہ تو اس زمانہ میں کسی کی یہ جرأت ہوئی نہ اس کے بعد سے آج تک اور نہ قیامت تک یہ کسی سے ہو سکے گا اور بھلا کیسے ہو سکتا؟ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل اسی طرح اس کا کلام بھی حقیقت بھی یہ ہے کہ قرآن پاک بہ یک نظر دیکھنے سے اس کی ظاہری اور باطنی لفظی اور معنوی وہ وہ کمالات ظاہر ہوتے ہیں جو مخلوق کے بس کے نہیں خود ربّ العالمین فرماتا ہے۔ الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ الخ یعنی اس کتاب کی آیتیں جو حکمت والے خبردار خداوند کی طرف سے نازل شدہ ہیں محکم مضبوط اور مفصل الگ الگ ہیں۔ پس الفاظ محکم اور معانی مفصل یا الفاظ مفصل اور معانی محکم۔ پس قرآن اپنے الفاظ میں اور اپنے مضامین میں بے نظیر ہے جس کے مقابلے اور معارضے سے جس کی نظیر اور مثل سے دنیا عاجز اور بے بس ہے۔ اس پاک کلام میں جو اگلی خبریں دنیا پر پوشیدہ تھیں وہ ہوبہو بیان کی گئیں، آنے والے اُمور کے تذکرے ہوئے جو لفظ بہ لفظ پورے اترے، تمام بھلائیوں کے حکم اس میں تمام برائیوں سے ممانعت اس میں ہے سچ ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا یعنی سچائی خبروں میں اور عدل احکام میں تیرے ربّ کے کلام میں پورا پورا ہے۔ یہ پاکیزہ قرآن سارا کا سارا حق و صداقت عدالت اور ہدایت سے پُر ہے۔

### قرآن شاعری نہیں

نہ اس میں واہی تباہی باتیں ہیں نہ اس میں ہنسی مذاق کذب و افترا جو شاعروں کے کلام میں عموماً پایا جاتا ہے، بلکہ ان کے اشعار کی قدر و قیمت ہی اسی پر ہے مقولہ مشہور ہے کہ اَعْذَبُهٗ اَكْذَبُهٗ جو جھوٹ زیادہ وہ زیادہ مزیدار۔ تم دیکھو گے کہ لمبے لمبے پر زور قصیدے مبالغہ اور کذب آمیز یا تو عورتوں کی تعریف و توصیف میں

ہوں گے یا گھوڑوں کی اور شراب کی ستائش میں ہوں گے یا کسی انسان کی بڑھی چڑھی مدح و تعریف میں ہوں گے یا اونٹنیوں کی آرائش و زیبائش یا بہادری کے پرمبالغہ گیت یا لڑائیوں کی چالبازیوں یا ڈر خوف کے خیالی منظروں کے بیان میں ہوں گے جن سے کوئی فائدہ نہیں نہ دین کا نہ دنیا کا صرف شاعر کی زباندانی اور اسکی قدرت کلام ظاہر ہوتی ہے اور بس نہ تو اخلاق پر ان سے کوئی عمدہ اثر نہ اعمال پر پھر نفس مضمون کے بھی پورے قصیدے میں بمشکل دو ایک شعر ہوتے ہیں۔ باقی سب بھرتی کے ادھر کے لایعنی اور فضول بکواس کے۔ برخلاف اس کے قرآن پاک پر نظر ڈالو تو دیکھو گے کہ اس کا ایک ایک لفظ فصاحت و بلاغت سے دین دنیا کے نفع سے خیر و برکت سے پر ہے۔ پھر کلام کی ترتیب و تہذیب الفاظ کی بندش اور عبارت کی روانی معانی کی نورانیت مضمون کی پاکیزگی سونے پر سہاگہ ہے اسکی خبروں کی حلاوت اس کے بیان کردہ واقعات کی سلاست مردہ دلوں کی زندگی ہے، اس کا اختصار کمال اعلیٰ نمونہ اور اس کی تفصیل معجزے کی جان ہے اس کا کسی چیز کو دوہرانا قند مکرر کا مزہ دیتا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا سچے موتیوں کی بارش برس رہی ہے، بار بار پڑھو اور دل نہ اکتائے مزے لیتے جاؤ اور ہر وقت نیا مزہ پاؤ مضامین کو سمجھتے جاؤ اور ختم نہ ہوں۔ یہ قرآن پاک کا ہی خاصہ ہے۔ اسی چاشنی کا ذائقہ اسی مٹھاس کا مزہ کوئی ان سے پوچھے جنہیں عقل و حواس علم و فضل کا کچھ حصہ قدرت نے عطا فرمایا ہو۔ اس کا ڈراوا اور دھمکاوا عذابوں اور پکڑ دھکڑ کا بیان مضبوط پہاڑوں کو دہلا دے انسانی دل تو کیا ہیں۔ اس کے وعدے اور خوشخبریاں نعمتوں اور رحمتوں کا بیان دلوں کی پژمردہ کلی کو کھلا دینے والا شوق و تمنا کے دبے بھینچے جذبات کو ابھار دینے والا جنتوں اور راحتوں کے پیارے پیارے مناظر کو آنکھوں کے سامنے کر دینے والا ہے۔ دل کھل جاتے ہیں اور کان لگ جاتے ہیں، آنکھیں کھل جاتی ہیں، رغبت دیتے ہوئے وہ فرماتا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ الخ کوئی کیا جانے کہ اس کے نیک اعمال کے بدلے اُسکی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان چپکے چپکے تیار کیا جا رہا ہے وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ الخ اس ہمیشگی والے جنت میں ہر وہ چیز ہے جو دل کو بھائے اور آنکھوں میں کھب جائے۔ ڈراتے اور دھمکاتے ہوئے فرماتا ہے۔ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ فرمایا ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ۔ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ۔ کیا تم اپنے دھنسائے جانے آسمان سے پتھر برسائے جانے سے نڈر گئے ہو؟ کیا آسمانوں والا اس پر قادر نہیں؟ اسے محض دھمکی ہی نہ سمجھو بلکہ اسکی حقیقت عنقریب تم پر کھل جائے گی۔ زجر و توبیخ ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ الخ ایک ایک کو ہم نے اسکی بدکرداریوں میں پکڑ لیا۔ بطرز وعظ و نصیحت بیان ہوتا ہے اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِیْنَ ۝ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یُمَتَّعُوْنَ ۝ اگر ہم نے کچھ سال انہیں فائدہ بھی دیا تو کیا ہوا؟ آخر وعدے کی گھڑی آ پہنچی اور اس جاہ و جلال نے کوئی نفع نہ بخشا۔ غرض کوئی کہاں تک بیان کرے جس مضمون کو بھی لیا اسے کمال تک پہنچا کر چھوڑا ہے اور طرح طرح کی فصاحت و بلاغت حلاوت و حکمت سے معمور کر دیا ہے حکم احکام روک ٹوک کو دیکھئے ہر حکم اچھائی بھلائی نفع اور پاکیزگی کا جامع۔ ہر ممانعت قباحت رذالت دنائت اور خباثت کی قاطع۔ ابن مسعودؓ وغیرہ اسلاف امت کا قول ہے کہ جب قرآن میں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سنو تو کان لگا دو کہ یا تو کسی اچھائی کا حکم ہو گا یا کسی برائی سے منع کیا جائیگا۔ خود پروردگار عالم فرماتے ہیں یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ الخ بھلائیوں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے، خبیث چیزیں حرام کرتا ہے۔ وہ بوجھل بیڑیاں جو پاؤں میں تھیں وہ سخت طوق جو گلے میں تھے اتار پھینکتا ہے الخ قیامت کے بیان کی آیتیں وہاں کے ہولناک منظر جنت دوزخ کا بیان رحمتوں اور زحمتوں کا پورا پورا وصف اولیاء اللہ کے لئے طرح طرح کی نعمتیں دشمنان خدا کیلئے طرح طرح کے عذاب کہیں بشارت

ہے کہیں ڈراوا ہے کہیں نیکیوں کی طرف رغبت ہے کہیں بدکاریوں سے ممانعت ہے کہیں دنیا کی طرف زہد کرنے کی کہیں آخرت کی طرف رغبت کرنے کی تعلیم ہے یہی وہ تمام آیتیں ہیں جو راہ راست دکھاتی ہیں اور بہترین رہنمائی کرتی ہیں اور خدا کی پسندیدہ شریعت کی طرف جھکاتی ہیں، اور دلوں کو جلا دیتی ہیں اور شیطانی دروازوں کو بند کر دیتی ہیں اور برے اثرات زائل کرتی ہیں۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر نبی کو ایسے معجزے دیئے گئے کہ جنہیں دیکھ کر لوگ ان پر ایمان لائے اور میرا معجزہ خدا کی وحی یعنی قرآن پاک ہے۔ اسلئے مجھے امید ہے کہ میرے تابعدار بہ نسبت اور نبیوں کے بہت زیادہ ہوں گے اس لئے کہ اور انبیاء کے معجزے ان کے ساتھ چلے گئے، لیکن حضورؐ کا یہ معجزہ قیامت تک باقی رہے گا۔ لوگ اسے دیکھتے جائیں گے اور اسلام میں داخل ہوتے جائیں گے، حضورؐ کا یہ بیان کہ میرا معجزہ وحی ہے جو مجھ کو دیا گیا ہے سے مطلب یہ ہے کہ یہ معجزہ میرے ساتھ خاص ہے اور یہ قرآن پاک مجھی کو ملا ہے جو اپنے معارضے اور مقابلے سے تمام دنیا کو عاجز کر دینے والا ہے۔ بخلاف دوسری آسمانی کتابوں کے کہ وہ اکثر علماء کے نزدیک اس وصف سے خالی ہیں واللہ اعلم۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آپ کی صداقت اور دین اسلام کی حقانیت پر علاوہ اس معجزے کے اور بھی اس قدر دلائل ہیں جو گنے بھی نہیں جا سکتے۔ وللہ الحمد والمنۃ۔ بعد متکلمین نے قرآن کریم کے اعجاز کو ایسے طریقہ پر بیان کیا ہے جو اہل سنت کے اور معتزلہ کے قول کو شامل ہے وہ کہتے ہیں کہ یا تو یہ قرآن فی نفسہٖ معجزہ ہے انسان کے امکان میں ہی نہیں کہ وہ اس جیسا بنا لا سکے۔ انھیں اس کا معارضہ کرنے کی قدرت و طاقت ہی نہیں۔ یا یہ کہ گو اس کا معارضہ ممکن ہے اور انسانی طاقت سے باہر نہیں، لیکن باوجود اس کے انھیں معارضہ کا چیلنج دیا جاتا ہے وہ عداوت اور دشمنی میں بڑھے ہوئے ہیں، وہ دین حق کو مٹانے کے لئے ہر وقت ہر طاقت کے خرچ کرنے اور ہر چیز کے برباد کرنے کے لئے تیار ہیں —— تاہم قرآن کا معارضہ اور مقابلہ ان سے نہیں کیا سکتا۔ یہ دلیل ہے اس بات پر کہ یہ کہ یہ قرآن کی جانب سے ہے کہ باوجود قدرت و طاقت ہونیکے وہ انھیں روک دیتا ہے اور وہ قرآن کا مثل پیش کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ گو یہ پچھلی وجہ اتنی پسندیدہ نہیں تاہم اگر اسے بھی مان لیا جائے تو اس سے بھی قرآن پاک کا معجزہ ہونا ثابت ہے جو بطریق تنزل حمایت حق اور مناظرے کی —— صلاحیت رکھتا ہے۔ امام رازی رحؒ نے بھی چھوٹی چھوٹی سورتوں کے سوال کے جواب میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

**وَقُود**

وَقُود کے معنی ایندھن کے ہیں جس سے آگ جلائی جائے۔ جیسے چھپٹیاں لکڑیاں وغیرہ۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ظالم لوگ جہنم کی لکڑیاں ہیں۔ اور جگہ فرمایا تم اور تمہارے وہ معبود جو خدا کے سوا ہیں جہنم کی لکڑیاں ہیں تم سب اس میں آؤ گے اگر وہ سچے معبود ہوتے تو وہاں وارد نہ ہوتے۔ دراصل یہ سب کے سب اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور حِجَارَة کہتے ہیں پتھر کو۔ یہاں مراد گندھک کے سخت سیاہ اور بڑے بڑے اور بدبودار پتھر ہیں جن کی آگ بہت تیز ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ان پتھروں کو زمین و آسمان کی پیدائش کے ساتھ ہی اسمان اول پر پیدا کیا گیا ہے (ابن جریر ابن ابی حاتم مستدرک حاکم) ابن عباسؓ ابن مسعود اور چند صحابہؓ سے سدی نے نقل کیا ہے کہ جہنم میں یہ سیاہ گندھک کے پتھر بھی ہیں جن کی سخت آگ سے کافروں کو عذاب دیا جائے گا۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں ان پتھروں کی بدبو مردار کی بدبو سے بھی زیادہ سخت ہے محمد بن علی اور ابن جریج بھی کہتے ہیں۔ مراد گندھک کے بڑے بڑے اور سخت پتھر ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے مراد وہ پتھر ہیں جن کی تصویریں وغیرہ بنائی جاتی تھیں اور پھر ان کی پرستش کی جاتی تھی جیسے اور جگہ ہے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ الخ تم اور تمہارے وہ معبود جو خدا کے سوا ہیں جہنم کی لکڑیاں ہو الخ قرطبی اور رازی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ گندھک کے پتھر کو آگ لگنا کوئی نئی بات نہیں اسلئے مراد یہی اصنام و انداد بت اور جو پتھر کسی شکل میں بھی اللہ کے سوا پوجے جاتے ہوں، لیکن یہ وجہ کوئی قوی وجہ نہیں اس لئے کہ جب آگ گندھک کے پتھروں سے سلگائی جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی تیزی اور حرارت معمولی آگ سے

بہت زیادہ ہوگی اس کا بھڑکنا اور جلنا اور سوزش اور شعلے بھی بہت زیادہ ہوں گے۔ علاوہ اسکے پھر سلف سے بھی اس کی تفسیر یہی مروی ہے اسی طرح ان پتھروں میں آگ کا لگنا بھی ظاہر ہے اور آیت میں مقصود آگ کی تیزی اور اس کی سوزش کا بیان کرنا ہے اور اسکے بیان کیلئے بھی یہاں پتھر سے مراد گندھک کے پتھر لینا ہی زیادہ مناسب ہے تاکہ وہ آگ تیز ہو اور اس سے بھی عذاب میں سختی ہو۔ قرآن کریم میں ہے كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِيْرًا۔ جہاں شعلے ہلکے ہوئے کہ ہم نے اور بھڑکا دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ہر موذی آگ میں ہے لیکن یہ حدیث محفوظ و معروف نہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ ہر وہ شخص جو دوسروں کو ایذا دے جہنمی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایذا دہندہ چیز جہنم کی آگ میں موجود ہوگی جو جہنمیوں کو عذاب دیگی۔ اُعِدَّتْ یعنی تیار کی گئی سے مراد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگ کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد پتھر ہوں یعنی وہ پتھر تیار کئے گئے ہیں کافروں کے لئے ابن مسعود کا یہی قول ہے اور فی الحقیقت دونوں معنی میں کوئی اختلاف نہیں اسلئے کہ پتھروں کا تیار کیا جانا آگ کے جلانے کے لئے ہے اور آگ کے تیار کرنے کیلئے پتھروں کا تیار کیا جانا ضروری ہے۔ لہذا ایک دوسرے کے ساتھ لازم ملزوم ہوگیا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ہر وہ شخص جو کفر پر ہو اس کے لئے وہ آگ تیار ہے۔ اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ جہنم اب بھی موجود اور پیدا شدہ ہے کیونکہ اُعِدَّتْ کا لفظ ہے اور اسکی دلیل میں بہت سی حدیثیں بھی ہیں۔ ایک طویل حدیث میں ہے۔ جنت اور دوزخ میں جھگڑا ہوا الخ دوسری حدیث میں ہے جہنم نے اللہ تعالیٰ سے دو سانس لینے کی اجازت چاہی اور اسے سردی میں ایک سانس لینے کی اور گرمی میں دوسرا سانس لینے کی اجازت دی گئی۔ تیسری حدیث میں ہے صحابہؓ کہتے ہیں ہم نے ایک مرتبہ بڑے زور کی ایک آواز سنی۔ حضورؐ سے پوچھا یہ کس چیز کی آواز ہے۔ آپؐ نے فرمایا ستر سال پہلے ایک پتھر جہنم میں پھینکا گیا تھا آج وہ پہنچا۔ چوتھی حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے سورج گہن کی نماز پڑھتے ہوئے جہنم کو دیکھا۔ پانچویں حدیث میں ہے کہ آپؐ نے شب معراج میں جہنم کو اور اسکے عذابوں کو ملاحظہ فرمایا۔ اسی طرح کی اور بہت سی صحیح متواتر احادیث ہیں معتزلہ اپنی جہالت کی وجہ سے اسے نہیں مانتے اور اس کے خلاف کہتے ہیں اور قاضی اندلس منذر بن سعید بلوطی نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔

## فائدہ

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں اور سورۂ یونس میں جو کہا گیا ہے کہ ایک ہی سورت اسکے مانند لاؤ یہ شامل ہے چھوٹی بڑی ہر سورت کو اس لئے کہ عربیت کے قاعدے کے مطابق جو اسم نکرہ ہو اور شرط کے طور پر لایا گیا ہو وہ عمومیت کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ نکرہ نفی کی تحت میں استغراق کا فائدہ دیتا ہے۔ پس لمبی سورتوں اور چھوٹی سورتوں میں ہر ایک میں اعجاز ہے اور اس بات پر سلف و خلف کا اتفاق ہے۔

## امام رازیؒ کی تحقیق

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ سورت کا لفظ سورۂ کوثر اور سورۃ العصر اور سورۂ قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○ جیسی چھوٹی سورتوں کو بھی شامل ہے اور یہ بالیقین معلوم ہے کہ اس جیسی یا اس سے قریب قریب کسی سورت کا بنا لینا ممکن ہے اسے انسانی طاقت سے خارج کہنا نری ہٹ دھرمی اور بے جا طرفداری ہے تو ہم جواب دیں گے کہ ہم نے اسکے معجز نما ہونیکے دو طریقے بیان کر کے دوسرے طریقہ کو اسی لئے پسند کیا ہے۔ ہم کہتے اگر یہ چھوٹی سورتیں بھی فصاحت و بلاغت میں اسی پایہ کی ہیں کہ وہ معجزہ کہی جا سکیں اور ان کا تعارض ممکن نہ ہو تو مقصود حاصل ہوگیا اور اگر یہ سورتیں ایسی نہیں تو بھی ہمارا مقصود حاصل ہے اسلئے کہ باوجود ان جیسی سورتوں کے بنا لانے پر انسانی قدرت ہونیکے پھر لوگوں کا نہ بنا سکنا باوجود سخت ترد شمنی اور ہر طرح کی زبردست کوششوں کے صاف دلیل ہے۔ اس امر پر کہ یہ قرآن مع اپنی چھوٹی چھوٹی سورتوں کے سراسر معجزہ ہے۔ یہ تو ہے کلام رازیؒ کا۔ لیکن صحیح تر قول یہ ہے کہ قرآن پاک کی ہر چھوٹی بڑی سورت فی الواقع معجزہ ہے اور انسان اسکی نظیر بنانے سے محض عاجز اور بالکل ناطاقت ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر لوگ غور و تدبر سے عقل و ہوش سے صرف سورۂ وَالْعَصْرِ کو سمجھ لیں تو سب کو کافی ہو جائے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب وفد میں مُسَیلمہ کذاب کے پاس گئے اور ابھی یہ خود بھی مسلمان نہ ہوئے تو مسیلمہ نے ان سے پوچھا کہ تم آرہے ہو بتاؤ تو آجکل کوئی تازہ وحی بھی نازل ہوئی ہے؟ اس نے کہا ابھی ابھی ایک مختصر سی سورت نازل ہوئی ہے جو بے حد

فصیح و بلیغ اور جامع و مانع ہے پھر سورۂ والعصر پڑھ کر سنائی تو مسیلمہ نے کچھ دیر سوچ کر اس کے مقابلہ میں کہا کہ مجھ پر بھی ایک ایسی ہی سورت نازل ہوئی ہے۔ اس نے کہا ہاں تم بھی سناؤ تو اس نے کہا یَا وَبْرُہ اِنَّمَا اَنْتَ اُذُنَانِ وَصَدْرٌ وَسَائِرُکَ حَقْرٌ فَقْرٌ ۵ یعنی اے جنگلی چوہے تیرا وجود سوائے دو کانوں اور سینے کے اور کچھ بھی نہیں باقی تو سراسر بالکل ناچیز ہے۔ پھر فخریہ کہنے لگا کہو اے عمرو کیسی کہی؟ اس نے کہا مجھ سے کیا پوچھتے ہو اسے تو خود جانتا ہے کہ سراسر کذب و بہتان ہے۔ بھلا کہاں فضول کلام اور کہاں حکمتوں سے پر وہ کلام؟

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ

اے پیغمبر ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کئے اچھے خوشخبری دو اس بات کی بیشک ان کیواسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہونگی انکے نیچے سے نہریں جب کبھی دیئے جاوینگے وہ لوگ

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ

بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار میں یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمکو ملا تھا اس سے پیشتر اور ملیگا بھی۔ انکو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا اور ان کے واسطے ان

مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۵

بہشتوں میں بیبیاں ہوں گی صاف پاک کی ہوئی۔ اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ بسنے والے ہوں گے۔

چونکہ پہلے کافروں اور دشمنان دین کی سزا عذاب اور رسوائی کا ذکر ہوا تھا اسلئے یہاں ایمانداروں اور نیک صالح لوگوں کی جزا ثواب اور سرخروئی کا بیان ہوا۔ قرآن کے مثانی ہونیکے ایک معنی یہ بھی ہیں اور صحیح تر قول بھی یہی ہے کہ اس میں ہر مضمون جوڑ جوڑ ہے اس کا مفصل بیان بھی کسی مناسب جگہ آئیگا۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کیساتھ ہی کفر کا، کفر کے ساتھ ایمان کا، نیکوں کے ساتھ بدوں کا اور بدوں کے ساتھ نیکوں کا ذکر ضرور آتا ہے جس چیز کا بیان ہوتا ہے ساتھ ہی اس کے مقابلہ کی چیز کا بھی ذکر ہو جاتا ہے۔ کسی چیز کو ذکر کر کے اس کی نظیر کو بھی کہیں بیان کیا گیا ہے۔ یہ معنی ہیں مُتَشَابِہ ہونیکے اور یہ دونوں لفظ قرآن کے اوصاف میں وارد ہوئے ہیں اسے مثانی بھی کہا گیا ہے اور متشابہ بھی فرمایا گیا ہے۔ جنتوں کے نیچے نہریں بہنا اس کے درختوں اور بالاخانوں کے نیچے بہنا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ نہریں بہتی ہیں لیکن گڑھا نہیں اور حدیث میں ہے کہ نہر کوثر کے دونوں کنارے سچے موتیوں کے قبے ہیں اسکی مٹی مشک خالص ہے اور اس کی کنکریاں لؤلؤ اور جواہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی یہ نعمتیں عطا فرمائے وہ احسان کرنیوالا اور بڑا رحیم ہے۔ حدیث میں ہے جنت کی نہریں مشکی پہاڑوں کے نیچے سے جاری ہوتی ہیں (ابن ابی حاتم) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہ مروی ہے۔ جنتیوں کا یہ قول کہ پہلے بھی ہمیں یہ دیئے گئے تھے اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں بھی یہ میوے ہمیں ملے تھے۔ صحابہ وغیرہ سے یہ مروی ہے ابن جریر بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے پہلے یعنی کل بھی یہی دیئے گئے تھے۔ یہ اس لئے کہیں گے کہ ظاہری صورت و شکل میں وہ بالکل مشابہ ہوں گے۔ یحییٰ بن کثیر کہتے ہیں کہ ایک پیالہ آئیگا کھائیں گے پھر دوسرا آئے گا تو کہیں گے یہ تو ابھی کھایا ہے۔ فرشتے کہیں گے۔ آپ کھائیے تو۔ گو صورت شکل یکساں ہے۔ لیکن مزہ اور ہے فرماتے ہیں جنت کی گھانس زعفران ہے اس کے ٹیلے مشک کے ہیں چھوٹے چھوٹے خوبصورت غلمان ادھر ادھر سے میوے لا لا کر پیش کر رہے ہیں وہ کھا رہے ہیں وہ پھر پیش کرتے ہیں تو کہتے ہیں اسے تو ابھی کھایا ہے وہ جواب دیتے ہیں حضرت رنگ و روپ ایک ہے لیکن ذائقہ اور ہی ہے چکھ دیکھئے۔ کھاتے ہیں تو اور ہی لطف پاتے ہیں۔ یہی معنی ہیں کہ ہم شکل لائیں گے۔ دنیا کے میووں سے بھی نام اور شکل و صورت میں ملتے جلتے ہوں گے لیکن مزہ کچھ دوسرا ہی ہوگا۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ صرف نام میں مشابہت ہے ورنہ کہاں یہاں کی چیز کہاں وہاں کی۔ یہاں تو فقط نام ہی ہے۔ عبدالرحمٰن کا قول ہے کہ دنیا کے پھلوں جیسے پھل دیکھ کر

کہدیں گے کہ یہ تو کھا رکھا۔ مگر جب چکھیں گے تو لذت کچھ اور ہی ہوگی۔ وہاں جو بیویاں انہیں ملیں گی وہ گندگی ناپاکی حیض ونفاس، پیشاب پاخانہ، تھوک رینٹ منی وغیرہ پاک صاف ہونگی۔ حضرت حوا علیہا السلام بھی پہلے حیض سے پاک تھیں، لیکن نافرمانی سرزد ہوتے ہی یہ بلا آگئی، لیکن یہ قول سنداً غریب ہے ایک غریب مرفوع حدیث میں ہے کہ حیض، پاخانہ، تھوک، رینٹ سے وہ پاک ہیں۔ حاکم اس حدیث کو صحیح اور شرط شیخین پر بتلاتے ہیں، لیکن یہ دعوی صحیح نہیں اس کے ایک راوی عبدالرزاق بن عمر بزیعی ہیں جنھیں ابو حاتم البستی نے احتجاج کے قابل نہیں سمجھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں، بلکہ حضرت قتادہؒ کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔ ان تمام نعمتوں کیساتھ اس زبردست نعمت کو دیکھئے کہ نہ یہ نعمتیں فنا ہوں نہ نعمتوں والے فنا ہوں نہ نعمتیں ان سے چھینیں نہ یہ نعمتوں سے الگ کئے جائیں۔ نہ موت ہے نہ خاتمہ ہے نہ آخر ہے نہ ٹوٹنا ہے اور کم ہونا ہے۔ اللہ رب العالمین جواد وکریم ورحیم سے التجا ہے کہ وہ مالک ہمیں بھی اہل جنت کے زمرے میں شامل کرے اور انھیں کے ساتھ ہمارا حشر کرے۔ آمین۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ بیان کر دیں کوئی مثال بھی۔ خواہ مچھر کی ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو سو جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں

فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ

خواہ کچھ ہی ہو وہ تو یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال تو بہت ہی موقع کی ہے ان کے رب کی جانب سے اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں۔ سو چاہے کچھ

بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۲۶

بھی ہو جائے وہ یوں ہی کہتے رہیں گے وہ کون مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے گمراہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ

کو اور ہدایت کرتے ہیں اسکی وجہ سے بہتوں کو اور گمراہ نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف بے حکمی کرنیوالوں کو جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس

اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

معاہدے کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اسکے استحکام کے بعد اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو وابستہ رکھنے کا اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں۔ یہ لوگ پورے خسارے میں پڑنے والے ہیں . . . .

ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ جب اوپر کی تین آیتوں میں دو مثالیں منافقوں کی بیان ہوئیں یعنی آگ کی اور پانی کی تو وہ کہنے لگے کہ ایسی ایسی . . . چھوٹی مثالیں اللہ تعالیٰ ہرگز بیان نہیں کرتا۔ اس پر یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں جب قرآن پاک میں مکڑی اور مکھی کی مثال بیان ہوئی تو مشرک کہنے لگے۔ بھلا ایسی حقیر چیزوں کے بیان کی قرآن جیسی خدائی کتاب میں کیا ضرورت؟ تو جواباً یہ آیتیں اتریں اور کہا گیا کہ حق کے بیان سے اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا خواہ وہ کم ہو یا زیادہ لیکن اس سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ آیت مکہ میں اتری حالانکہ ایسا نہیں واللہ اعلم۔ اور بزرگوں سے بھی اسی طرح کا شان نزول مروی ہے۔

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ یہ خود ایک مستقل مثال ہے جو دنیا کی بیان کی گئی ہے۔ مچھر جس وقت بھوکا ہوتا ہے زندہ رہتا ہے جہاں موٹا تازہ ہوا مرا۔ اسی طرح یہ لوگ ہیں کہ جب دنیاوی نعمتیں دل کھول کر حاصل کر لیتے ہیں وہیں اللہ کی پکڑ آ جاتی ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ جب یہ ہماری نصیحت بھول جاتے ہیں ہم ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیتے ہیں یہاں تک کہ اترانے لگتے ہیں۔ اب دفعتاً ہم انھیں پکڑ لیتے ہیں (ابن جریر، ابن ابی حاتم) امام ابن جریرؒ نے پہلے قول کو پسند فرمایا ہے اور مناسبت بھی اسی کی زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم۔ تو مطلب یہ ہوا کہ کوئی سی مثال چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ نہ رکتا ہے نہ جھجکتا ہے۔ لفظ یہاں پر کمی کے معنی بتانے کے لئے ہے اور بَعُوْضَةً کا زیر بدلیت کی بناء پر عربی قاعدے کے مطابق ہر جوادنیٰ چیز پر صادق آسکتا ہے، یا نکرہ موصوفہ ہے اور بَعُوْضَةٌ صفت ہے، ابن جریرؒ مَا کا موصولہ ہونا اور بَعُوْضَةٌ کا اسی کے اعراب سے معرب ہونا پسند فرماتے ہیں اور کلام عرب میں یہ بکثرت شائع ہے کہ وہ مَا اور مَنْ کے صلہ کو انہی دونوں کا اعراب دے دیا کرتے ہیں اس لئے کبھی یہ نکرہ ہوتے ہیں اور کبھی معرفہ جیسے کہ حسان بن ثابتؓ کے شعروں میں ہے ؎

يَكْفِيْ بِنَا فَضْلًا عَلٰى مَنْ غَيْرِنَا ۔ حُبُّ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ إِيَّانَا "(ترجمہ۔ ہمیں غیروں پر صرف یہی فضیلت کافی ہے کہ ہمارے دل حبّ نبیؐ سے پُر ہیں" اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بَعُوْضَةً منصوب ہو حذف جار کی بناء پر اور اس سے پہلے بَیْنَ کا لفظ مقدر مانا جائے۔ کسائی و فراء اسی کو پسند کرتے ہیں ضحاک اور ابراہیم بن عبلہ بَعُوْضَةٌ پڑھتے ہیں۔ ابن جنی کہتے ہیں یہ مَا کا صلہ ہوگا اور عائد حذف مانی جائیگی جیسے تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنُ میں فَمَا فَوْقَهَا کے دو معنی بیان کئے ہیں ایک تو یہ کہ اس سے بھی ہلکی اور ردی چیز جیسے کسی شخص کی بخیلی وغیرہ کا ایک بیان کرے تو دوسرا کہتا ہے وہ اس سے بھی سوا ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ گرا ہوا ہے۔ کسائی اور ابو عبیدہ کہتے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر دنیا کی قدر خدا کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پلاتا۔ دوسرے یہ معنی ہیں کہ اس سے زیادہ بڑی اسلئے کہ بھلا مچھر سے ہلکی اور چھوٹی چیز اور کیا ہوگی؟ قتادہ بن دعامہ کا یہی قول ہے، ابن جریرؒ بھی اسی کو پسند فرماتے ہیں صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ کسی مسلمان کے کانٹا چبھے یا اس سے زیادہ تو اس پر بھی اُسکے درجے بڑھتے ہیں اور گناہ مٹتے ہیں اس حدیث میں بھی یہی لفظ فَمَا فَوْقَهَا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ان چھوٹی بڑی چیزوں کے پیدا کرنے سے شرماتا نہیں اور نہ رکتا ہے اسی طرح انھیں مثال کے طور پر بیان کرنے سے بھی اسے کوئی عار نہیں ایک جگہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو! ایک مثال بیان کیجاتی ہے کان لگا کر سنو جنھیں خدا کے سوا پکار سکتے ہو وہ سب کے سارے جمع ہو جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی اگر ان سے کچھ چھین لیجائے تو یہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔ عابد اور معبود دونوں ہی بیحد کمزور ہیں دوسری جگہ فرمایا ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو مددگار بناتے ہیں مکڑی کے جالے جیسی ہے جس کا گھر تمام گھروں سے زیادہ بودا اور کمزور ہے اور جگہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی مثال دی پاک درخت سے جس کی جڑ مضبوط ہو اور جسکی شاخیں آسمان میں ہوں جو بحکم خداوندی ہر وقت پھل دیتا ہو ان مثالوں کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے غور و تدبر کیلئے بیان فرماتا ہے اور ناپاک کلام کی مثال ناپاک درخت جیسی ہے جو زمین کے اوپر ہی ہو۔ اور جڑیں مضبوط نہ ہوں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو مضبوط بات کے ساتھ دنیا اور آخرت میں برقرار رکھتا ہے اور ظالموں کو گمراہ کرتا ہے اللہ جو چاہے کرے۔ اور جگہ فرمایا اللہ تعالیٰ اس مملوک غلام کی مثال پیش کرتا ہے جسے کسی چیز پر اختیار نہیں اور جگہ فرمایا ہے دو شخصوں کی مثال اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے جن میں ایک تو گونگا اور بالکل گرا پڑا بے طاقت ہے جو اپنے آقا پر بوجھ ہے جہاں جائے برائی ہی لیکر آئے۔ اور دوسرا وہ جو عدل و حق کا حکم کرے کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ الخ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے خود تمہاری مثال بیان فرماتا ہے کیا تم اپنی چیزوں میں اپنے غلاموں کو بھی اپنا شریک اور برابر کا حصہ دار سمجھتے ہو؟ اور جگہ ارشاد ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کی مثال بیان فرماتا ہے جسکے بہت سے برابر کے شریک ہوں الخ اور جگہ ارشاد باری ہے ان مثالوں کو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں اور انھیں (پوری طرح) صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں، انکے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ بعض سلف صالحینؒ فرماتے ہیں جب میں قرآن میں کسی مثال کو سنتا ہوں اور سمجھ نہیں سکتا تو مجھے رونا آتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان مثالوں کو صرف عالم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں مثالیں خواہ چھوٹی ہوں خواہ بڑی ایماندار ان پر ایمان لاتے ہیں اور انھیں حق جانتے ہیں اور ان سے ہدایت پاتے ہیں۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ وہ انھیں خدا کا کلام سمجھتے ہیں اَنَّهُ کی ضمیر کا مرجع مثال ہے یعنی مومن اس مثال کو خدا کی جانب سے اور حق سمجھتے ہیں اور کافر باتیں بناتے ہیں جیسے سورۂ مدثر میں ہے وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ الخ۔ یعنی ہم نے

آگ والے فرشتوں کی گنتی کو کفار کی آزمائش کا سبب بنایا ہے' اہل کتاب یقین کرتے ہیں' ایماندار ایمان میں بڑھ جاتے ہیں ان دونوں جماعتوں کو کوئی شک نہیں رہتا لیکن بیمار دل اور کفار کہہ اٹھتے ہیں کہ اس سے کیا مراد؟ اسی طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے' تیرے رب کے لشکروں کو اسکے سوا کوئی نہیں جانتا' یہاں بھی اسی ہدایت و ضلالت کو بیان کیا۔ صحابہ کرام ؓ سے مروی ہے کہ اس سے گمراہ منافق ہوتے ہیں اور مومن پاتے ہیں وہ اپنی گمراہی میں بڑھ جاتے ہیں کیونکہ باوجود اس علم کے کہ مثال حق ہے' درست اور صحیح ہے' پھر بھی وہ اسے جھٹلاتے ہیں اور مومن اقرار کر کے ہدایت و ایمان کو بڑھا لیتے ہیں' فاسقین سے مراد منافق ہیں بعضوں نے کہا ہے کہ کافر مراد ہیں جو پہچانتے ہیں اور انکار کرتے ہیں حضرت سعد کہتے ہیں مراد خوارج ہیں اگر اس قول کی سند حضرت سعد بن وقاص ؓ سے صحیح ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ تفسیر معنوی ہے یہ نہیں کہ اس سے مراد خوارج ہیں بلکہ یہ فرقہ بھی فاسقوں میں داخل ہے جنھوں نے نہروان میں حضرت علی ؓ پر چڑھائی کی تھی تو یہ لوگ گو نزول آیت کے وقت موجود نہ تھے لیکن اپنے بدترین وصف کی وجہ سے معناً یہ بھی فاسقوں میں داخل ہیں انھیں خارجی اسلئے کہا گیا ہے کہ امام برحق کی اطاعت سے نکل گئے تھے اور شریعتِ اسلامی کی پابندی سے آزاد ہو گئے تھے لغت میں فاسق کہتے ہیں اطاعت و فرمانبرداری سے نکل جانے والے کو' جب چھلکا ہٹا کر خوشہ نکلتا ہے تو عرب کہتے ہیں فَسَقَتْ چوہے کو بھی فُوَیْسِقَہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بلوں سے نکل کر فساد کرتا ہے صحیحین کی حدیث میں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' پانچ جانور فاسق ہیں حرم میں اور باہر حرم کے قتل کر دیئے جائیں۔ کوا' چیل' بچھو' چوہا اور کالا کتا۔ پس لفظ فاسق کافر کو اور ہر نافرمان کو شامل ہے لیکن کافر کا فسق زیادہ سخت اور زیادہ برا ہے اور آیت میں مراد فاسق سے کافر ہے واللہ اعلم۔ اسکی بڑی دلیل یہ ہے کہ بعد میں ان کا وصف یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عہد توڑتے ہیں اسکے فرمان کاٹتے ہیں اور زمین فساد پھیلاتے ہیں اور یہ سب اوصاف کفار کے ہیں مومنوں کے اوصاف تو اس کے برخلاف ہوتے ہیں جیسے سورۂ رعد میں بیان ہے' کہ اَفَمَنْ یَّعْلَمُ الخ پس وہ شخص جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر اترا وہ حق ہے کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہو' نصیحت تو صرف عقلمند حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے وعدوں کو پورا کرتے ہیں اور میثاق توڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے انھیں جوڑتے ہیں اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور حساب کی برائی سے کانپتے رہتے ہیں الخ آگے چل کر فرمایا جو لوگ اللہ کے عہد کو اس کی مضبوطی کے بعد توڑیں اور جس چیز کے ملانے کا خدا کا حکم ہو وہ اسے نہ ملائیں اور زمین فساد پھیلائیں اُن کے لئے لعنتیں ہیں اور انکے لئے برا گھر ہے۔ یہاں عہد سے مراد وہ وصیت ہے جو خدا نے بندوں کو کی تھی جو اسکے تمام احکام بجا لانے اور تمام نافرمانیوں سے بچنے کو شامل ہے اس کا توڑ دینا اُس پر عمل نہ کرنا ہے بعض کہتے ہیں کہ توڑنے والے اہل کتاب کے کافر اور ان کے منافق ہیں اور عہد وہ ہے جو ان سے تورات میں لیا گیا تھا کہ وہ اسکی تمام باتوں پر عمل کریں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں جب بھی آپ تشریف لے آئیں آپ کی نبوت کا اقرار کریں اور جو کچھ آپ خدا کی جانب سے لیکر آئیں اسکی تصدیق کریں' اور اس عہد کو توڑ دینا یہ ہے کہ انھوں نے آپ کی نبوت اور علامت کا انکار کر دیا باوجود علم کے اور باوجود عہد کے اُسے چھپایا اور دنیاوی مصلحتوں کی بنا پر اسکے خلاف کیا۔ امام ابن جریرؒ اس قول کو پسند کرتے ہیں اور مقاتل بن حیانؒ کا بھی یہی قول ہے بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی خاص جماعت نہیں بلکہ شرک کفر و نفاق والے سب کے سب مراد ہیں' عہد سے مراد اپنی توحید کا اور اپنے نبی کی نبوت کا اقرار کرانا ہے جس پر کھلی ہوئی نشانیاں اور بڑے بڑے معجزے موجود ہیں اور اس کا توڑ دینا توحید و سنت سے منہ موڑنا انکار کرنا ہے' یہ قول زیادہ قوی اور مناسب ہے' زمخشری کا میلان بھی اسی طرف ہے وہ کہتے ہیں عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید ماننے کا اقرار ہے' جو فطرت انسان میں داخل ہونے کے علاوہ روز میثاق میں بھی اس کا وعدہ لیا گیا تھا' فرمایا گیا تھا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ "کیا میں تمہارا رب نہیں؟" تو سب نے جواب دیا' بلیٰ "بے شک تو ہمارا رب ہے"' پھر جو کتابیں دی گئیں اُن میں بھی اقرار کرایا گیا جیسے اَوْفُوْا بِعَھْدِیْ الخ "میرے عہد کو نبھاؤ میں بھی اپنے وعدے پورے کروں گا"' بعض کہتے ہیں مراد وہ عہد ہے جو روحوں سے لیا تھا جب انھیں حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالا گیا تھا جیسے فرمایا ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ الخ "جب تیرے رب نے اولاد آدم سے وعدہ لیا کہ میں ہی تمہارا رب ہوں اور ان سب نے اقرار کیا الخ" اور اس کا توڑنا اس کا چھوڑنا ہے

یہ تمام اقوال تفسیر ابن جریر میں منقول ہیں۔

## علامات منافق

ابو العالیہؒ فرماتے ہیں عہد خداوندی کو توڑنا جو منافقوں کا کام تھا وہ یہ چھ خصلتیں ہیں، بات کرنے میں جھوٹ بولنا۔ وعدہ خلافی کرنا، امانت میں خیانت کرنا، اللہ کے عہد کو اسکی مضبوطی کے بعد توڑ دینا، اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے ملائے جانے کا حکم دیا ہے انھیں نہ ملانا۔ زمین میں فساد پھیلانا۔ یہ چھ خصلتیں ان کی اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب کہ ان کا غلبہ ہو اور جب وہ مغلوب ہوتے ہیں تو تین اگلے کام کرتے ہیں۔ سدی فرماتے ہیں قرآن کے احکام کو پڑھنا جاننا، سچ کہنا پھر نہ ماننا بھی عہد کو توڑنا تھا اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے ان سے مراد صلہ رحمی کرنا، قرابت کے حقوق ادا کرنا وغیرہ ہے جیسے اور جگہ قرآن مجید میں ہے فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ۔ قریب ہے کہ تم اگر لوٹو تو زمین میں فساد کرو اور رشتے ناتے توڑ دو" ابن جریرؒ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت عام ہے جس کے ملانے ادا کرنے کا حکم باری تھا انہوں نے اسکو توڑا اور نہ کیا۔

خَاسِرُوْنَ سے مراد آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں جیسے فرمان باری ہے اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝ "ان لوگوں پر لعنت ہے اور ان کے لئے برا گھر ہے" حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے کہ اہل اسلام کے سوا دوسروں کو جہاں قرآن نے خاسر کہا ہے وہاں مراد کافر ہے اور اہل اسلام کے لئے جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں مراد گنہگار ہیں خَاسِرُوْنَ جمع ہے خَاسِرٌ کی، چونکہ ان لوگوں نے نفسانی خواہشوں اور دنیوی لذتوں میں پڑ کر رحمت خداوندی سے دوری حاصل کرلی اس لئے انھیں نقصان یافتہ کہا گیا ہے جیسے وہ شخص جسے اپنی تجارت میں گھاٹا آئے اسی طرح یہ کافر و منافق ہیں کہ جب رحم و کرم کی بہت ہی حاجت ہوگی یعنی قیامت والے دن، اس دن رحمت خداوندی سے یہ محروم رہ جائیں گے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ

بھلا کیونکر ناسپاسی کرتے ہو اللہ کے ساتھ حالانکہ تھے تم محض بے جان سو تم کو جاندار کیا، پھر تم کو موت دیں گے پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۲۸

کے دن، پھر انہی کے پاس لیجائے جاؤ گے۔

## وجود باری پر پرزور دلائل

اس بات کا ثبوت دیتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے وہ قدرتوں والا ہے وہی پیدا کرنے والا ہے اور اختیار والا ہے، اس آیت میں فرمایا، تم اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ یا اس کے ساتھ دوسرے کو کیسے پوج سکتے ہو؟ جب تمہیں عدم سے وجود میں لانے والا ایک وہی ہے جیسے اور جگہ فرمایا، کیا یہ بغیر کسی چیز کے پیدا کئے گئے؟ یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ یا انہوں نے زمین و آسمان بھی پیدا کیا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ بے یقین لوگ ہیں۔ اور جگہ ارشاد ہوتا ہے هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۝ یقیناً انسان پر وہ زمانہ بھی آیا ہے جسوقت یہ قابل ذکر چیز ہی نہ تھا، اور بھی اس طرح کی بہت سی آیتیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ کفار جو کہیں گے۔ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ الخ اے اللہ تو نے دو دفعہ ہمیں مارا اور دو دفعہ جلایا، ہمیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے الخ اس سے مراد یہی ہے جو اس آیت وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا الخ کا مطلب ہے کہ تم اپنے باپوں کی پیٹھ میں مردہ تھے یعنی کچھ بھی نہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مار ڈالے گا، یعنی موت ایک روز ضرور آئے گی، پھر تمہیں قبروں سے وہ اٹھائے گا۔ پس ایک حالت دنیا میں آنے سے پہلے پھر دوسری دنیا میں مرنے کی اور قبروں کی طرف جانے کی پھر روز قیامت میں اٹھ کھڑے ہونے کی، دو زندگیاں اور دو موتیں۔ ابو صالحؒ فرماتے ہیں کہ قبر میں انسان کو زندہ کر دیا جاتا ہے عبدالرحمن بن زید کا بیان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ میں انہیں پیدا کیا پھر ان سے عہد و پیمان لیکر بیجان کر دیا پھر ماں کے پیٹ میں انہیں پیدا کیا پھر دنیوی موت ان پر آئی پھر قیامت والے دن انھیں زندہ کریگا لیکن یہ رائے کمزور ہے پہلا قول ہی ٹھیک ہے ابن مسعود ابن عباسؓ

اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ قرآن میں اور جگہ ہے قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ الخ "اللہ ہی تمہیں پیدا کرتا ہے پھر تمہیں قیامت کے دن جمع کریگا الخ" ان پتھروں اور تصویروں کو جنھیں مشرکین پوجتے تھے قرآن نے مردہ کہا ہے، فرماتا ہے أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ "وہ سب مردہ ہیں زندہ نہیں۔" زمین کے بارے میں فرمایا وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ الخ۔ "انکے لئے مردہ زمین بھی نشان ہے جسے ہم زندہ کرتے ہیں اور اس سے دانے نکالتے ہیں جسے یہ کھاتے ہیں۔"

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ

وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف سو

سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

درست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں

اوپر کی آیت میں ان دلائل قدرت کا بیان ہوا تھا جو خود انسان کے اندر ہیں اس لئے اس مبارک آیت میں ان دلائل کا بیان ہو رہا ہے جو روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اِسْتَوَا یہاں پر قصد کرنے اور متوجہ ہونے کے معنی میں ہے اس لئے کہ اس کا صلہ إِلَىٰ ہے، سَوَّاهُنَّ کے معنی درست کرنے اور ساتوں کو بنانے کے ہیں سَمَاءِ اسم جنس ہے پھر بیان فرمایا کہ اس کا علم محیط کل ہے جیسے اور جگہ ارشاد ہے: أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کیا وہ بے علم ہو سکتا ہے جو خالق ہو؟ سورۂ سجدہ کی آیت قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ الخ گویا اس آیت کی تفصیل ہے جس میں فرمایا ہے کیا تم اس خدا کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا، کیا تم اس کے لئے شریک ٹھہراتے ہو؟ جو رب العالمین ہے جس نے زمین میں مضبوط پہاڑ اوپر سے گاڑ دیئے ہیں جس نے اس زمین میں برکتیں اور روزیاں رکھیں اور چار دن میں زمین کی سب چیزیں درست کر دیں جس میں دریافت کرنے والوں کی تشفی ہے۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہو کر جو دھوئیں کی شکل میں تھے فرمایا کہ اے زمینو اور آسمانو خوشی یا ناخوشی سے آؤ، تو دونوں نے کہا، باری تعالیٰ ہم تو خوشی خوشی حاضر ہیں، دو دن میں آسمانوں کو پورا کر دیا اور ہر آسمان میں اس کا کام بانٹ دیا اور دنیا کے آسمان کو ستاروں کے ساتھ مزین کر دیا اور انہیں (شیطانوں سے) بچاؤ بنایا، یہ ہے اندازہ اس خدا کا جو بہت بڑا غالب اور بہت بڑا علم والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے زمین پیدا کی پھر ساتوں آسمانوں کو بنایا اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عمارت کا یہی قاعدہ ہے کہ پہلے نیچے کا حصہ بنایا جائے پھر اوپر کا۔ مفسرین نے بھی اس کی تصریح کی ہے جس کا بیان ابھی آتا ہے انشاء اللہ تعالیٰ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم میں اور جگہ ہے ءَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ الخ تمہاری پیدائش مشکل ہے یا آسمانوں کی؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی موٹائی بلند کر کے انھیں ٹھیک ٹھاک کیا اور ان میں سے رات دن پیدا کئے پھر اس کے بعد زمین پھیلائی اس سے پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو گاڑا جو سب تمہارے اور تمہارے جانوروں کے کام کی چیزیں ہیں اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمان کے بعد ہے، بعض بزرگوں نے تو فرمایا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں ثُمَّ صرف عطف خبر کے لئے ہے عطف فعل کے لئے نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ زمین کے بعد آسمان کی پیدائش شروع کی بلکہ صرف خبر دینا مقصود ہے کہ آسمانوں کو بھی پیدا کیا اور زمینوں کو بھی۔ عرب شاعروں کے شعروں میں یہ موجود ہے کہ کہیں ثُمَّ صرف خبر کا خبر پر عطف ڈالنے کے لئے ہوتا ہے تقدیم تاخیر مراد نہیں ہوتی۔ اور بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آیت ءَأَنتُمْ الخ میں آسمانوں کی پیدائش کے بعد زمین کا پھیلانا اور بچھانا وغیرہ بیان ہوا ہے نہ کہ پیدا کرنا۔ تو ٹھیک یہ ہے کہ پہلے زمین کو پیدا کیا پھر آسمان کو، پھر زمین کو ٹھیک ٹھاک کیا تو دونوں آیتیں ایک دوسرے کی مخالف نہ رہیں۔ اس عیب سے خدا کا کلام بالکل محفوظ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں (یعنی پہلے زمین کی پیدائش پھر آسمانوں کی۔ البتہ زمین کی درستی وغیرہ بعد کی چیز ہے،

حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ سے مروی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور کسی چیز کو پیدا نہیں کیا تھا جب اور مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو پانی سے دھواں بلند کیا وہ اونچا چڑھا اور اس سے آسمان بنائے پھر پانی خشک ہوگیا اور اس کی زمین بنائی پھر اسی کو الگ الگ کر کے سات زمینیں بنائیں اتوار اور پیر کے دو دن میں یہ ساتوں زمینیں بن گئیں زمین مچھلی پر ہے مچھلی وہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے نٓ ۚ وَالْقَلَمِ مچھلی پانی میں ہے اور پانی صفاۃ پر ہے اور صفاۃ فرشتہ پر اور فرشتہ پتھر پر اور یہ پتھر وہ ہے جس کا ذکر لقمان نے کیا ہے۔ یہ پتھر ہوا پر ہے مچھلی کے ہلنے سے زمین کانپنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو گاڑ دیا اور وہ ٹھہر گئی، یہی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ الخ زمین نہ ہلے اس لئے ہم نے اس میں پہاڑ جما دیے ہیں۔ پہاڑ، زمین کی پیداوار درخت وغیرہ زمین کی کل چیزیں منگل اور بدھ کے دو دنوں میں پیدا کیں، اسی کا بیان قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ الخ والی آیت میں ہے پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی جو دھواں تھا آسمان بنایا۔ پھر اسی میں سے سات آسمان بنائے جمعرات اور جمعہ کے دو دنوں میں، جمعہ کے دن کو اسی لئے جمعہ کہا جاتا ہے کہ اس میں زمین و آسمان کی پیدائش جمع ہو گئی ہر آسمان میں اس نے فرشتوں کو پیدا کیا اور ان چیزوں کو جن کا علم اسکے سوا کسی کو نہیں' آسمانِ دنیا کو ستاروں کے ساتھ زینت دی اور انہیں شیطان سے حفاظت کا سبب بنایا' ان تمام چیزوں کو پیدا کر کے پروردگار نے عرش عظیم پر قرار پکڑا جیسے فرماتا ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یعنی چھ دن میں آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کر کے پھر عرش پر مستوی ہو گیا اور جگہ فرمایا كَانَتَا رَتْقًا الخ یعنی یہ دونوں دھواں سے بنے ہم نے انہیں پھاڑا اور پانی سے ہر چیز کی زندگی کی (تفسیر سدی) یہ موقوف قول جس میں کئی قسم کا احتمال ہے، بظاہر ایسی اہم بات میں حجت تامہ نہیں ہو سکتا۔ (واللہ اعلم)

ابن جریر میں ہے حضرت عبداللہ بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اتوار سے مخلوق کی پیدائش شروع ہوئی دو دن میں زمینیں پیدا ہوئیں دو دن میں ان کی تمام چیزیں پیدا کیں اور دو دن میں آسمانوں کو پیدا کیا جمعہ کے دن آخری وقت ان کی پیدائش ختم ہوئی اور اسی وقت حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اسی وقت میں قیامت قائم ہوگی۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا اس سے جو دھواں اوپر چڑھا اس کے آسمان بنائے جو ایک پر ایک اس طرح سات ہیں اور زمینیں ایک کے نیچے ایک اس طرح سات ہیں، اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمانوں سے پہلے ہے جیسے سورۂ سجدہ میں ہے علماء بھی اس پر متفق ہیں صرف قتادہؒ فرماتے ہیں کہ آسمان زمین سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ قرطبی اس میں توقف کرتے ہیں وَالنّٰزِعٰتِ کی آیت کی وجہ سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں آسمان کی پیدائش کا ذکر زمین سے پہلے ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے جب یہ سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ زمین پیدا تو آسمانوں سے پہلے کی گئی ہے لیکن پھیلائی گئی ہے بعد میں یہی جواب عام علماء کا ہے سورۂ وَالنّٰزِعٰتِ کی تفسیر میں بھی اس کا بیان آئیگا انشاء اللہ حاصل امر یہ ہے کہ زمین کا پھیلانا اور بچھانا بعد میں ہے اور دَحٰىهَا کا لفظ قرآن میں ہے اور اس کے بعد جو پانی چارہ پہاڑ وغیرہ کا ذکر ہے یہ گویا اس لفظ کی تشریح ہے، جن جن چیزوں کی نشوونما کی قوت اس زمین میں رکھی تھی ان سب کو ظاہر کر دیا اور زمین کی پیداوار طرح طرح کی مختلف شکل اور مختلف قسموں کی نکل آئی اسی طرح آسمان میں بھی ٹھیرے رہنے والے چلنے والے ستارے وغیرہ بنائے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ صحیح مسلم اور نسائی میں حدیث ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا مٹی کو اللہ تعالیٰ نے ہفتہ والے دن پیدا کیا اور پہاڑوں کو اتوار کے دن اور درختوں کو پیر کے دن اور برائیوں کو منگل کے دن اور جانوروں کو جمعرات کے دن اور آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر کے بعد جمعہ کی آخری ساعت میں عصر کے بعد سے رات تک۔ یہ حدیث غرائب مسلم میں سے ہے۔ امام ابن مدینی امام بخاری وغیرہ نے اس میں کلام کیا ہے کہ کعبؓ کا اپنا قول ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ نے کعب کا یہ کلام سنا ہے اور بعض راویوں نے اسے غلطی سے مرفوع حدیث قرار دے لیا ہے۔ امام بیہقی یہی کہتے ہیں ؛

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپکے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو

فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

کرینگے اور خونریزیاں کرینگے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں بحمد اللہ اور تقدیس کرتے رہتے ہیں آپکی حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جسکو تم نہیں جانتے

اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو دیکھو کہ اس نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے سے پہلے فرشتوں میں اُن کا ذکر کیا جس کا بیان اس آیت میں ہے فرماتا ہے کہ اے نبی تم یاد کرو اور اپنی اُمت کو یہ خبر پہنچاؤ۔ ابو عبیدہ تو کہتے ہیں کہ لفظ اِذْ یہاں زائد ہے لیکن ابن جریرؒ وغیرہ مفسرین اس کا ذکر کرتے ہیں خَلِیْفَۃً سے مراد یہ ہے کہ ان کے بعد بھی جانشین ہوں گے یکے بعد دیگرے اور ایک زمانہ کے بعد دوسرے زمانہ میں یوں ہی قرنوں تک یہ سلسلہ رہے گا۔ جیسے اور جگہ ارشاد ہے هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ اور فرمایا وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ یعنی تمھیں اس نے زمین کا خلیفہ بنایا اور جگہ فرمایا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو فرشتوں کو اس زمین میں تمہارا خلیفہ بنادیتے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ ان کے بعد ان کے خلیفہ یعنی جانشین بُرے لوگ ہوئے۔ ایک شاذ قرأت میں خَلِیْقَۃً بھی ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خلیفہ سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں لیکن اس میں تامل ہے۔ تفسیر رازی وغیرہ میں اس اختلاف کو ذکر کیا گیا ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطلب نہیں اسکی ایک دلیل تو فرشتوں کا یہ قول ہے کہ وہ زمین میں فساد کرینگے اور خون بہائیں گے ظاہر ہے کہ انھوں نے اولاد آدم کی نسبت یہ فرمایا تھا نہ کہ خاص حضرت آدم کی نسبت یہ اور بات ہے کہ اس کا علم فرشتوں کو کیونکر ہوا؟ یا تو کسی خاص طور سے انھیں یہ معلوم ہوا ہوگا یا بشری طبیعت کے اقتضا کو دیکھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہوگا کیونکہ یہ فرما دیا گیا تھا کہ اسکی پیدائش مٹی سے ہوگی، یا لفظ خلیفہ کے مفہوم سے انھوں نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ وہ فیصلہ کرنیوالا، مظالم کی روک تھام کرنے والا، اور حرام کاموں اور گناہوں کی باتوں سے روکنے والا ہوگا یا انھوں نے چونکہ زمین کی پہلی مخلوق کو دیکھا تھا اُسی پر اُسے قیاس کیا ہوگا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ فرشتوں کی یہ عرض بطور اعتراض کے نہ تھی، نہ بنی آدم پر حسد کی وجہ سے تھی، جن لوگوں کا یہ خیال ہے وہ قطعی غلطی کر رہے ہیں، فرشتوں کی شان میں قرآن فرماتا ہے لَا یَسْبِقُوْنَہٗ بِالْقَوْلِ یعنی جس بات کے دریافت کرنے کی اُنھیں اجازت نہ ہو اُس میں وہ لب نہیں ہلاتے (اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فرشتوں کی طبیعت حسد سے پاک ہے) بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ یہ سوال صرف اس حکمت کے معلوم کرنے کیلئے اور اس راز کے ظاہر کرنے کے لئے تھا جو انکی سمجھ سے بالاتر تھا، یہ تو جانتے تھے کہ اس مخلوق میں فسادی لوگ بھی ہونگے تو اب باادب سوال کیا کہ پروردگار ایسی مخلوق کے پیدا کرنے میں کونسی حکمت ہے؟ اگر عبادت مقصود ہے تو عبادت تو ہم کرتے ہی ہیں۔ تسبیح و تقدیس و تحمید ہر وقت ہماری زبانوں پر ہے اور پھر فساد وغیرہ سے پاک ہیں تو پھر اور مخلوق جن میں فسادی بھی ہونگے کس مصلحت پر پیدا کی جاتی ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کا جواب دیا کہ باوجود اس کے فساد کے پھر بھی اسے جن مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر میں پیدا کر رہا ہوں انھیں میں ہی جانتا ہوں تمہارا علم اُن تک نہیں پہونچ سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں انبیاء اور رسول ہونگے، ان میں صدیق اور شہید ہوں گے ان میں عابد و زاہد، اولیاء، ابرار، نیک کار، مقرب بارگاہ، علماء، صلحاء، متقی پرہیزگار، خوف خداوندی، حب باری رکھنے والے ہونگے، میرے احکام کی بسر و چشم تعمیل کرنے والے، میرے نبیوں کے ارشاد پر لبیک کہنے والے ہونگے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ دن کے فرشتے صبح صادق کے وقت آتے ہیں اور عصر کو چلے جاتے ہیں اور اس وقت رات کے فرشتے آتے ہیں وہ پھر صبح جائیں گے، آنے والے جب آتے ہیں تب اور جاتے ہیں تب صبح کی اور عصر کی نماز میں لوگوں کو پاتے ہیں اور دربار خداوندی میں پروردگار کے سوال کے جواب میں دونوں جماعتیں یہی کہتی ہیں کہ گئے تو نماز میں پایا اور آئے تو نماز میں چھوڑ کر آئے یہی ہے وہ مصلحت خداوندی جیسے فرشتوں سے فرمایا تھا کہ میں جانتا ہوں اور تم نہیں جانتے۔ ان فرشتوں کو اسی چیز کے دیکھنے کے لئے بھیجا جاتا ہے اور دن کے اعمال رات سے پہلے اور رات کے دن سے پہلے خداوند عالم کی طرف چڑھائے جاتے ہیں غرض تفصیلی حکمت جو پیدائش انسان میں تھی اسکی نسبت فرمایا کہ یہ میرے مخصوص علم میں ہے تمہیں معلوم ہی نہیں بعض کہتے ہیں یہ جواب ہے انکے اس قول کا کہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں، تو انھیں فرمایا گیا کہ میں ہی جانتا ہوں یعنی تم جیسا اپنے تئیں سمجھتے ہو، اور سب کو یکساں کر رہے ہو ایسا نہیں بلکہ تم میں ابلیس بھی ہے۔ ایک تیسرا قول یہ ہے کہ فرشتوں کا یہ سب کہنا اسی وجہ سے تھا کہ ہمیں زمین میں بسایا جائے تو جواباً کہا گیا کہ تمہاری آسمانوں میں رہنے کی مصلحت میں ہی جانتا ہوں اور مجھے علم ہے کہ تمہارے

لائق جگہ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔ حسن قتادہؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خبر دی، سدی کہتے ہیں مشورہ لیا۔ لیکن اس کے معنی بھی خبر دینے کے ہو سکتے ہیں اگر نہ ہوں تو پھر یہ قول گرا ہوا ہے۔ ابن ابی حاتم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مکہ سے زمین پھیلائی اور بچھائی گئی تو بیت اللہ شریف کا طواف سب سے پہلے فرشتوں نے کیا اور زمین میں خلیفہ بنانا ہے یہ حدیث مرسل ہے پھر اس میں ضعف ہے اور مُدرج ہے یعنی زمین سے مکہ مراد لینا راوی کا اپنا خیال ہے۔ واللہ اعلم۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے مراد عام ہے ساری زمین مراد ہے فرشتوں نے جب یہ سنا تو پوچھا تھا کہ وہ خلیفہ کیا ہوگا؟ اور جواب میں کہا گیا تھا کہ اسکی اولاد میں ایسے لوگ بھی ہونگے جو زمین میں فساد کریں حسد بغض کریں قتل و خون کریں، ان میں وہ عدل و انصاف کریگا اور میرے احکام جاری کریگا تو اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور جو ان کے قائم مقام ہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور مخلوق میں عدل و انصاف کرنے میں، لیکن فساد پھیلانے اور خون بہانے والے خلیفہ نہیں، یہ یاد رہے کہ یہاں مراد خلافت سے ایک زمانہ والوں کا دوسرے زمانہ والوں کے بعد آنا ہے خلیفہ فعیلہ کے وزن پر ہے۔ جب ایک کے بعد دوسرا اس کے قائم مقام ہو تو عرب کہتے ہیں خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا فلاں شخص فلاں کا خلیفہ ہوا جیسے قرآن میں ہے کہ ہم ان کے بعد تمہیں زمین کا خلیفہ بنا کر دیکھتے ہیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو اور اسی لئے سلطانِ اعظم کو خلیفہ کہتے ہیں اسلئے کہ وہ اگلے بادشاہ کا جانشین ہوتا ہے، محمد ابن اسحاق کہتے ہیں، مراد ہے کہ زمین کا ساکن اس کو آباد کرنیوالا، ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں پہلے زمین میں جنات بستے تھے انھوں نے اس میں فساد کیا اور خون بہایا اور قتل و غارت کیا، ابلیس کو بھیجا گیا اس نے اور اس کے ساتھیوں نے انھیں مار مار کر جزیروں اور پہاڑوں میں بھگا دیا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے زمین میں بسایا گیا تو گویا یہ ان پہلے والوں کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ پس فرشتوں کے قول سے مراد اولاد آدم ہیں جسوقت انسے کہا گیا کہ میں زمین کو اور اس میں بسنے والی مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہوں اسوقت زمین تھی لیکن اس میں آبادی نہ تھی بعض صحابہ سے یہ بھی مروی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں معلوم کرا یا تھا کہ اولاد آدم ایسے ایسے کام کریگی تو انھوں نے یہ پوچھا اور یہ بھی مروی ہے کہ جنات کے فساد پر انھوں نے بنی آدم کے فساد کو قیاس کر کے یہ سوال کیا حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آدمؑ سے دو ہزار سال پہلے سے جنات زمین میں آباد تھے۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں۔ فرشتے بدھ کے دن پیدا ہوئے اور جنات کو جمعرات کے دن پیدا کیا، اور جمعہ کے دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے حضرت حسن اور حضرت قتادہؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں خبر دی تھی کہ ابن آدم ایسا ایسا کرینگے اس بنا پر انھوں نے سوال کیا۔ ابوجعفر محمد بن علیؒ فرماتے ہیں۔ سجل نامی ایک فرشتہ ہے جس کے ساتھی ہاروت ماروت تھے اسے ہر دن میں تین مرتبہ لوحِ محفوظ پر نظر ڈالنے کی اجازت تھی، ایک مرتبہ اس نے آدم علیہ السلام کی پیدائش وغیرہ امور کا جب مطالعہ کیا تو چپکے سے اپنے ان دونوں ساتھیوں کو بھی خبر کر دی۔ اب جو اللہ تعالیٰ نے اپنا ارادہ ظاہر فرمایا تو ان دونوں نے یہ سوال کیا۔ لیکن یہ روایت غریب ہے اور قابل تردید ہے واللہ اعلم پھر اس میں ہے کہ دو فرشتوں نے یہ سوال کیا یہ قرآن کی روانی عبارت کے بھی خلاف ہے، یہ بھی روایت مروی ہے کہ یہ کہنے والے فرشتے دس ہزار تھے اور سب کے سب جلا دیئے گئے، یہ بھی اسرائیلی روایت ہے اور بہت ہی غریب ہے، امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں، اس سوال کی انھیں اجازت دی گئی تھی اور یہ بھی معلوم کرا دیا گیا تھا کہ یہ مخلوق نافرمان بھی ہوگی تو انھوں نے تعجب کے ساتھ مصلحت خداوندی معلوم کرنے کیلئے یہ سوال کیا نہ کہ کوئی مشورہ دیا ہو یا انکار کیا ہو یا اعتراض کیا ہو حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کی پیدائش شروع ہوئی تو فرشتوں نے کہا ناممکن ہے کہ کوئی مخلوق ہم سے زیادہ بزرگ اور عالم ہو تو ان پر یہ امتحان خداوندی آیا اور کوئی مخلوق امتحان سے نہیں چھوٹی زمین اور آسمان پر بھی امتحان آیا تھا اور انھوں نے سر خم کر کے اطاعت خداوندی کے لئے آمادگی ظاہر کی تھی، فرشتوں کی تسبیح و تقدیس سے مراد خداوند تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا نماز پڑھنا، بے ادبی سے بچنا، بڑائی عظمت وغیرہ کرنا، نافرمانی نہ کرنا سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ وغیرہ پڑھنا ہے قدس کے معنی پاک کے ہیں پاک زمین کو مقدس کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوتا ہے کہ کونسا کلام افضل ہے؟ جواب دیتے ہیں وہ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے پسند فرمایا ہے سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ ۝ (صحیح مسلم) حضور نے معراج والی رات آسمانوں میں فرشتوں کی یہ تسبیح سنی سُبْحَانَ الْعَلِیِّ الْاَعْلٰی سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی امام قرطبیؒ وغیرہ نے اس آیت سے استدلال

کیا ہے کہ خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ہے تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرے، اُن کے جھگڑے چکائے، مظلوم کا بدلہ ظالم سے لے، حدود قائم کرے، برائیوں کے کرنے سے لوگوں کو باز رکھے وغیرہ وغیرہ، بڑے بڑے کام جو بغیر امام کے انجام نہیں پا سکتے، چونکہ یہ کام واجب ہیں اور یہ بغیر امام کے پورے نہیں ہو سکتے۔ اور جو چیز بغیر واجب پوری نہ ہو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے، پس خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ثابت ہوا۔ امامت یا تو قرآن و حدیث کے ظاہری لفظوں سے ملے گی جیسے کہ اہل سنت کی ایک جماعت کا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت خیال ہے کہ اُن کا نام حضورؐ نے خلافت کے لئے لیا تھا، یا قرآن و حدیث سے اسکی جانب اشارہ ہو، جیسے اہل سنت ہی کی دوسری جماعت کا خلیفۂ اوّل کی بابت یہ خیال ہے کہ اشارۃً ان کا ذکر حضورؐ نے خلافت کے لئے کیا ہے، یا ایک خلیفہ اپنے بعد دوسرے کو نامزد کر جائے۔ جیسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا، یا وہ صالح لوگوں کی ایک کمیٹی بنا کر انتخاب کا کام ان کے سپرد کر جائے، جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا، یا اہل حل و عقد (یعنی با اثر سرداران لشکر، علماء صلحاء وغیرہ) اُسکی بیعت پر اجماع کریں یا اُن میں سے کوئی بیعت کر لے تو جمہور یہ کے نزدیک اس کا مان واجب ہو جائیگا۔ امام الحرمین نے اس پر اجماع نقل کیا ہے واللہ اعلم یا کوئی شخص لوگوں کو بزور و جبر اپنی اطاعت پر بے بس کر دے تو بھی واجب ہو جاتا ہے کہ اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں تاکہ پھوٹ اور اختلاف نہ پھیلے امام شافعیؒ نے صاف لفظوں میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس بیعت کے وقت گواہوں کی موجودگی کے واجب ہونے میں اختلاف ہے بعض تو کہتے ہیں یہ شرط نہیں بعض کہتے ہیں شرط ہے اور دو گواہ کافی ہیں۔ جبائی کہتا ہے بیعت کرنے والے اور جس کے ہاتھ پر بیعت ہوئی ہے ان دونوں کے علاوہ چار گواہ چاہئیں جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کے چھ ارکان مقرر کئے تھے پھر انھوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو اختیار دیا اور آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر باقی چاروں کی موجودگی میں بیعت کی لیکن اس استدلال میں کلام ہے واللہ اعلم۔

(۱) امام کا مرد ہونا (۲) آزاد ہونا (۳) بالغ ہونا (۴) عقلمند ہونا (۵) مسلمان ہونا (۶) عادل ہونا (۷) مجتہد ہونا (۸) آنکھوں والا ہونا (۹) صحیح و سالم اعضاء والا ہونا (۱۰) فنون جنگ سے اور (۱۱) رائے عامہ سے خبردار ہونا (۱۲) قریشی ہونا، واجب ہے اور یہی صحیح ہے، ہاں ہاشمی ہونا اور خطا سے معصوم ہونا شرط نہیں، یہ دونوں شرطیں غالی رافضی لگاتے ہیں۔ امام اگر فاسق ہو جائے تو اسے معزول کر دینا چاہئے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ معزول نہ کیا جائے، کیونکہ حدیث میں آچکا ہے کہ جب تک ایسا کھلا کفر، نہ دیکھ لو جس کے کفر ہونے کی ظاہر دلیل خدا کی طرف سے تمہارے پاس ہو، اسی طرح خود امام اپنے آپ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ خود بخود آپ ہی معزول ہو گئے تھے اور امر امامت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا تھا، لیکن یہ عذر کے باعث تھا جس پر ان کی تعریف کی گئی ہے، روئے زمین پر ایک سے زیادہ امام ایک وقت میں نہیں ہو سکتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب تمہارا کام اجتماعی طور پر ہو رہا ہو اور کوئی آکر افتراق پیدا کرنے لگے تو اُسے قتل کر دو خواہ کوئی بھی ہو، جمہور کا یہی مذہب ہے اور بہت سے بزرگوں نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، جن میں سے ایک امام الحرمین ہیں، کرامیہ (شیعہ) کا قول ہے کہ دو اور اس سے زیادہ بھی ایک وقت میں امام ہو سکتے ہیں، جیسے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں اطاعت کے لائق تھے۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ جب ایک وقت میں دو دو اور زیادہ نبیوں کا ہونا جائز ہے تو اماموں کا ہونا جائز کیوں نہ ہو؟ نبوت کا مرتبہ تو یقیناً امامت کے مرتبے سے بہت زیادہ ہے لیکن صحیح مسلم والی حدیث آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ دوسرے کو قتل کر ڈالو، اسلئے صحیح مذہب وہی ہے جو پہلے بیان ہوا۔ امام الحرمین نے استاد ابو اسحٰق سے بھی حکایت کی ہے کہ وہ دو اور زیادہ اماموں کا مقرر کرنا اس وقت جائز جانتے ہیں جب مسلمانوں کی سلطنت بہت وسیع ہو اور ہر طرف پھیلی ہوئی ہو، اور دونوں اماموں کے درمیان کئی ملکوں کا فاصلہ ہو، امام الحرمین اس میں متردد ہیں۔ خلفاء بنی عباس کا عراق میں، اور خلفاء بنی فاطمہ کا مصر میں، اور خاندان امویہ کا مغرب میں میرے خیال سے یہی حال تھا۔ اس کی بسط و تفصیل انشاء اللہ کتاب الاحکام کی کسی مناسب جگہ ہم کریں گے۔